حکومت بہار

اردو ڈائرکٹوریٹ

بہار، پٹنہ

فردنامہ-۱۰

شین مظفر پوری

ڈاکٹر ابوبکر رضوی

Monograph-10

Sheen Muzaffarpuri

By Dr. Abu Bakar Rizvi

شین مظفر پوری کا اصل نام محمد ولی الرحمٰن شیدا اور قلمی نام شین مظفر پوری تھا۔وہ شش جہات شخصیت کے حامل تھے۔افسانہ نگاری، ناول نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری کے علاوہ اردو صحافت میں بھی انھوں نے اپنی بہترین شناخت درج کی۔انھوں نے مذکورہ سبھی اصناف ادب میں کثرت سے خامہ فرسائی کی ،بطور خاص بے تحاشہ افسانے لکھے اور اِسی افسانہ نگاری نے اُن کو شہرت اور مقبولیت سے بھی ہمکنار کیا۔شین مظفر پوری میں بے پناہ ادبی و تخلیقی صلاحیت موجود تھی۔پانچ افسانوی مجموعے، پانچ ناولٹ، تین ناول کے علاوہ مضامین کا مجموعہ 'آدھی مسکراہٹ'، ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'خون کی مہندی' اور خودنوشت 'رقص بِسمل' ان کا سرمایہ افتخار ہے۔انھوں نے بہار اردو اکادمی کے ترجمان ماہنامہ 'زبان و ادب' میں بحیثیت مدیر اپنی منفرد صلاحیت کا مظاہرہ کر کے اس کے معیار اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر ابوبکر رضوی ایک اچھے ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ان کی تصنیفات 'امکان'، (مختصر تاریخ زبان وارود) 'قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری' 'اردو افسانے میں مہملیت' اور 'معاصر اردو شاعری اور فیض احمد فیض' ادبی حلقے میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ڈاکٹر ابوبکر رضوی کا شین مظفر پوری سے براہِ راست رابطہ اور واسطہ رہا۔انھیں ان کی شخصیت اور ادبی و صحافتی سرگرمیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقعے حاصل رہے۔انھوں نے شین مظفر پوری کی شخصیت اور ان کی ادبی و صحافتی، نگارشات پر بخوبی تنقیدی و تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے ان پر ایک بھرپور فردنامہ تخلیق کیا ہے۔امید ہے کہ آپ کو بھی ان کی یہ تصنیف پسند آئے گی۔ابوبکر رضوی فی الوقت ٹی. پی. ایس. کالج، پٹنہ میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِدبستانِ بہار

فرد نامہ

شین مظفرپوری

ڈاکٹر ابوبکر رضوی

طابع وناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۰

Sheen Muzaffarpuri

By

Dr. Abu Baker Rizvi

نام کتاب	:	شین مظفرپوری
مصنف	:	ڈاکٹر ابوبکر رضوی
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	136
کمپوزنگ	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ۔۴

رابطہ: 9334020186

ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱

فون نمبر: 0612-2530093، ای میل: directorurdu@gmail.com

مشمولات

پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
شین مظفر پوری: ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
ابتدائیہ :	ڈاکٹر ابوبکر رضوی	۸

عنوانات

حالاتِ زندگی	۱۱
افسانہ نگاری	۲۱
ناول نگاری	۴۰
ریڈیائی ڈرامے	۴۹
غیر افسانوی نثر	۵۳
(الف) طنز و مزاح نگاری	۵۳
(ب) خاکہ نگاری	۵۹
(ج) یادداشت	۶۳
صحافت نگاری	۷۱
منتخب تخلیقات	۸۱
کتابیات	۱۳۵

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سر بلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، فضلِ حق آزاد، شوق نیموی، انجم مانپوری، یاس یگانہ چنگیزی، بیدل عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجز، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، رمز عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کر سکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدر داں ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمز عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فرد نامے شائع کئے جا رہے ہیں۔

شین مظفر پوری کا اصل نام محمد ولی الرحمٰن شیدا اور قلمی نام شین مظفر پوری تھا۔ وہ شش جہات شخصیت کے حامل تھے۔ افسانہ نگاری، ناول نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری کے علاوہ اردو صحافت میں بھی انھوں نے اپنی بہترین شناخت درج کی۔ انھوں نے مذکورہ سبھی اصناف ادب میں کثرت سے خامہ فرسائی کی، بطور خاص بے تحاشہ افسانے لکھے اور اِسی افسانہ نگاری نے اُن کو شہرت اور مقبولیت سے بھی ہمکنار کیا۔ شین مظفر پوری میں بے پناہ ادبی و تخلیقی صلاحیت موجود تھی۔ پانچ افسانوی مجموعے، پانچ ناولٹ، تین ناول کے علاوہ مضامین کا مجموعہ 'آدھی مسکراہٹ'، ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'خون کی مہندی' اور خود نوشت 'رقصِ بسمل' ان کا سرمایہ افتخار ہے۔ انھوں نے بہار اردو اکادمی کے ترجمان ماہنامہ 'زبان و ادب' میں بحیثیت مدیر اپنی منفرد صلاحیت کا مظاہرہ کر کے اس کے معیار اور مقبولیت میں اضافہ کیا۔

اس فرد نامے کے مصنف ڈاکٹر ابوبکر رضوی ایک اچھے ناقد، محقق اور ادیب ہیں۔ ان کی تصنیفات 'امکان' (مختصر تاریخ زبان وادب)، قمر اعظم ہاشمی کی تنقید نگاری 'اردو افسانے میں مہملیت اور 'معاصر اردو شاعری اور فیض احمد فیض' ادبی حلقے میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر ابوبکر رضوی کا شین مظفر پوری سے براہِ راست رابطہ اور واسطہ رہا۔ انھیں ان کی شخصیت اور ادبی و صحافتی سرگرمیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے۔ انھوں نے شین مظفر پوری کی شخصیت اور ان کی ادبی و صحافتی، نگارشات پر بخوبی تنقیدی و تحقیقی نظر ڈالتے ہوئے ان پر ایک بھرپور فرد نامہ تخلیق کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی ان کی یہ تصنیف پسند آئے گی۔ ابوبکر رضوی فی الوقت ٹی. پی. ایس. کالج، پٹنہ میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

شین مظفر پوری: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

شین مظفر پوری کا اصل نام محمد ولی الرحمٰن شیدا تھا؛ لیکن اُنھوں نے اپنا قلمی نام شین مظفر پوری تجویز کیا۔ اِن کی پیدائش ۱۵ر جولائی ۱۹۲۰ء کو مظفر پور ضلع کے قصبہ باتھ اصلی میں ہوئی۔ وہ قومی سطح پر مشہور اور مقبول ایک بڑے افسانہ و ناول نگار تھے۔ انہوں نے طویل عرصے تک بڑے خوبصورت اور زندگی کی سچائیوں سے بھرپور افسانے و ناول لکھے۔ انہوں نے کم مدت میں ہی بڑی شہرت اور عزت حاصل کی۔ ان کا شمار بہار کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جنہیں عالمی سطح پر احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے افسانے کسی بھی زبان کے اچھے افسانوں کے مقابل نہایت اعتماد کے ساتھ رکھے جاسکتے ہیں، چوں کہ شین مظفر پوری کا تعلق اوسط درجہ کے گھرانے سے تھا اور انہوں نے زندگی کے کرب کو جھیلا تھا؛ اس لیے ان کی تخلیقات میں زندگی کی سچائیاں اور غربت کا کرب ہے۔ انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں زندگی کے حقائق کو آئینہ دکھانے والے مثبت فکر و نظر کے بہترین افسانے لکھے، جن کا مقصد سماجی برائیوں کا خاتمہ اور ایک مثالی اور معیاری سماج کی تشکیل ہے۔ شین مظفر پوری نے بڑی کثرت کے ساتھ بے تحاشہ افسانے لکھے۔ اس کثرت تخلیق کے سبب انھوں نے افسانوں کے معیار کا خیال نہیں رکھا۔ رسالوں کے مطالبے پر وہ افسانے لکھتے گئے اور انھوں نے ان پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر وہ اس طرف توجہ دیتے تو ان کے افسانوں پر جنسی اثرات اور معیار کا سوال نہیں اُٹھتا۔

بہرحال! ضرورت اس بات کی ہے کہ شین مظفر پوری کے افسانوں سے رطب و یابس کو الگ کر کے ان کا ایک معیاری انتخاب شائع کیا جائے؛ تاکہ اہالیانِ نقد و نظر ان کی فنی حیثیت اور مقام کا صحیح تعین کر سکیں، تب ہی شین مظفر پوری کے افسانوں کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

شین مظفر پوری میں بے پناہ تخلیقی صلاحیت تھی۔ وہ زودنویس تھے۔ انھوں نے کثرت سے مضامین اور افسانے لکھے۔ اُن کے اندر صحافیانہ صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ بہار اردو اکادمی کے ماہنامہ ''زبان و ادب'' میں بحیثیت مدیر انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، جس سے ''زبان وادب'' کے معیار اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

تصانیف

ناول

(۱) ہزار راتیں (۲) چاند پر داغ (۳) لڑکی جوان ہوگئی

ناولٹ

(۱) تین لڑکیاں ایک کہانی (۲) کھوٹا سکہ (۳) دوسری بدنامی
(۴) حلالہ (۵) فرصت

افسانوی مجموعہ

(۱) آوارہ گرد خطوط (۲) دُکھتی رگیں (۳) طلاق طلاق طلاق
(۴) قانون کی بستی (۵) نئی الف لیلہ

دیگر تصانیف

(۱) آدھی مسکراہٹ (مزاحیہ مضامین) (۲) خون کی مہندی (ریڈیائی ڈرامے)
(۳) رقصِ بسمل (خودنوشت)

عہدے اور اعزازات

❁ شین مظفر پوری کی بے پناہ ادبی صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہیں بہار اردو اکادمی کے ترجمان 'زبان وادب' کا مدیر بنایا گیا تھا۔

❁ بہار کے ایسے مایہ ناز افسانہ نگار کی ان کی زندگی میں کوئی قدردانی نہیں ہوئی اور نہ ہی انہیں کوئی اعزاز ملا۔

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

شین مظفر پوری کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار کے علاوہ ایک معتبر صحافی بھی تھے۔ کہانی لکھنا ان کا Passion اور صحافت نگاری ان کا پیشہ۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط اپنی ادبی زندگی میں انہوں نے تین سو سے زاید کہانیاں، دو ناولٹ، تین ناول، پچاس سے زیادہ انشائیے اور خاکے، درجنوں ریڈیائی ڈرامے، بچوں کے لیے دو کتابیں اور کئی کہانیاں اور 'رقصِ بسمل' کے نام سے اپنی یادداشت کے ذریعہ اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ بطور صحافی ہزاروں اداریے، سیکڑوں کالم، لاکھوں اخباری ترجمے، ایک فلم کا اسکرپٹ، ٹی.وی. سیریل کے لیے مکالمے بھی تحریر کیے۔ ایک غیر مطبوعہ ناول، غیر مطبوعہ کہانیوں کا مسودہ جو دوران سفر گم ہوگیا، کے ساتھ ساتھ چند غزلیں، اشعار اور نظمیں ان کے رشحات قلم سے معرض وجود میں آئیں۔ اس ضخیم ادبی سرمایے میں گل بھی ہیں خار بھی ہیں، خس وخاشاک بھی ہیں اور گوہر آبدار بھی ہیں۔ یہ قاری کے ظرف پر ہے کہ وہ کس کا انتخاب کرتا ہے۔

شین بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ افسانہ نگاری نے جہاں ان کو غیر معمولی مقبولیت وشہرت بخشی، وہیں ان کے ادبی قد کے تعین کی راہوں کو مسدود بھی کیا۔ اسے شین کی بدقسمتی کہیے، یا ہمارے ناقدین کی کم نظری، ان کے ابتدائی چند کمزور افسانوں کو بنیاد بنا کر انہیں نکارنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی؛ مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ شین کے افسانوں کی دنیا ان کے ارد گرد سانسیں لیتی ہوئی اس زندگی سے عبارت ہے، جسے ہم اور آپ 'عام آدمی' کہتے ہیں۔ غربت، حق تلفی اور ظلم کا لامتناہی سلسلہ شین کو حکایت خوں چکاں رقم کرنے کی جانب راغب کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شین کا فن

فکر و فلسفہ کی پیچیدگیوں سے واقف نہ تھا؛ بلکہ یہ واقعیت اور تجربے کی صداقت پر استوار ہے۔ عورتوں کے بارے میں شین نے جتنا اور جیسا لکھا ہے، اردو کے کسی مرد ادیب نے نہیں لکھا ہے؛ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ تانیثی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ شین کے افسانوں، ناولوں اور دیگر تخلیقات میں موجود ہے۔ یہ تمام چیزیں ہنوز ہماری تنقیدی نگاہ کی متقاضی ہیں۔

شین مظفر پوری میرے ہم وطن تھے۔ان کے گاؤں اور میرے گاؤں کے درمیان کا فاصلہ ۱۲ رکیلو میٹر ہے۔ میں خود کو ان خوش قسمتوں میں شمار کرتا ہوں، جنہوں نے شین کو نہ صرف دیکھا تھا؛ بلکہ قریب سے دیکھا تھا۔۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۲ء تک تقریباً ہر شام شین مظفر پوری سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ان کی حیات اور ادبی فتوحات سے میری براہ راست واقفیت اسی زمانے کی دین ہے۔ شین کے فن کو سمیٹنے کے لیے ہزاروں صفحات بھی کم ہیں۔ایک مختصر مونوگراف میں ان تمام تر ادبی کارناموں کا احاطہ کرنا مشکل کام تھا۔ میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ان کی حیات اور فن کا اکثر گوشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ حیات اور تخلیقات کے سلسلے میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں، وہ ان کی تحریروں کے علاوہ ان سے میری ہوتی رہی گفتگو پر مبنی ہیں۔ کتاب کے آخر میں شین کی تخلیقات کا انتخاب کرتے ہوئے میں نے یہ خیال رکھا ہے کہ ان کے ادبی وصحافتی کارناموں مثلاً افسانے، ناول، خاکے، انشایئے، یادداشت، اداریے، خطوط اور ڈراموں میں سے کوئی نہ کوئی عمدہ تخلیق آپ کے اعلیٰ ذوق کی تسکین کا سامان بنے۔

شین مظفر پوری پر کام کرنے کی میری دیرینہ خواہش تھی۔ منصبی اور خانگی مصروفیات اور ان سے زیادہ میری تساہلی اس خواہش کی تکمیل میں مانع رہی۔ میں محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار، اردو ڈائرکٹوریٹ کا ممنون ہوں کہ جس نے مجھے شین مظفر پوری جیسے عظیم المرتبت؛ مگر نظر انداز کردہ ادیب وصحافی پر مونوگراف تحریر کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر اور اردو کے بے لوث خادم جناب امتیاز احمد کریمی کی شفقت ومحبت کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ ہاں میں ان کی صحت ،ترقی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اسلم جاوداں، اردو پروگرام افسر مجھے بے حد عزیز رکھتے ہیں، مجھے اس کا اعتراف رہا ہے؛ مگر اس مونوگراف کو مکمل کرنے کے لیے انہوں نے وقت کی جو مراعات مجھے فراہم کیں، وہ ان کی عظمت کا مظہر ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ خدا بخش

اورینٹل پبلک لائبریری کے کارکن جناب محمد شاہجہاں قاسمی کا شکریہ ضروری ہے کہ انہوں نے شین صاحب کی کم یاب اور نایاب کتابیں دستیاب کرائیں۔

شریکِ حیات ڈاکٹر صبوحی اسلم، بیٹی اریبہ اور بیٹا احمد شاذ دعاؤں کے مستحق ہیں کہ اس پروجیکٹ کے لیے انہوں نے ہر طرح سے تعاون کیا بلکہ اکثر ان اوقات کی قربانی دی جن پر صرف ان کا حق تھا۔

پٹنہ، ۳۰ر اگست ۲۰۱۹ء

— ابو بکر رضوی

حالات زندگی

نام: اصل نام محمد ولی الرحمٰن تھا

قلمی نام: ابتدا میں ولی الرحمٰن شیدؔا کے نام سے شاعری کی۔ بعد میں شیدؔا مظفر پوری کے نام سے تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۹ء میں شین مظفر پوری ہو گئے اور زندگی کے آخری ایّام تک اسی نام سے لکھتے رہے۔ اخبار کے کالم اور مزاحیہ وطنزیہ کلام ''ورشم'' کے نام سے بھی شائع کیا، جو ولی الرحمٰن شیدؔا مظفر پوری کا مخفف ہے۔

والد کا نام: حافظ محمد عین الحق

یوم ولادت: ۱۵؍جولائی ۱۹۲۰ء

جائے پیدائش: موضع باتھ اصلی، تھانہ نان پور، ضلع مظفر پور (موجودہ سیتا مڑھی) بہار

تعلیم: ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی جہاں انہوں نے قرآن کریم (ناظرہ) اور اردو و فارسی کی تعلیم پائی۔ دس سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے جہاں تقریباً ایک سال تک ٹیوشن پڑھتے رہے اور ۱۹۳۱ء میں مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے اسلامیہ کالج، کلکتہ میں داخلہ لیا؛ مگر معاشی تنگی کے باعث تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

مختصر حالات زندگی: شین مظفر پوری شمالی بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں جہاں سیلاب اور غربت کا دور دورہ تھا، آنکھیں کھولیں۔ آپ کے دادا جناب شیخ کریم بخش ایک معمولی کسان تھے۔ گھر کا ماحول دینی تھا۔ والد محترم کلکتہ کے قصائی محلّہ کی ایک مسجد میں امام تھے۔ آپ ابھی ایک سال کے ہی تھے کہ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی پرورش آپ کی بڑی پھوپی محترمہ بی بی ولیہ نے کی۔ پھوپھی نے ہر طرح ماں کا پیار دیا؛ مگر والدہ کی جدائی نے ان کے اندر جس احساس محرومی کو جنم دیا، وہ ان کے لاشعور کا حصہ بن گیا۔ جابجا ان کی شخصیت اور فن دونوں میں اس کا اظہار ہوا ہے۔ 'کھوٹا سکہ' کا مرکزی کردار مسعود دراصل شین کی اپنی زندگی کا پرتو ہے۔ والد کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اخبار بینی اور فلم کے شوق نے رفتہ رفتہ شین مظفر پوری کو کہانیوں اور صحافت کی دنیا سے قریب کر دیا۔ فلم بینی سے متاثر ہو کر کہانیاں لکھنے لگے اور اخبار بینی نے صحافت کی خو بو پیدا کر دی۔ میٹرک کے زمانے میں اپنے نصاب میں شامل انگریزی ناول IVON HOE کے ایک کردار Rebecca سے متاثر ہو کر ایک کہانی لکھی، جس کا عنوان ''ایک یہودی دوشیزہ کی عصمت پرستی'' تھا۔ ان کے دوست افسر ماہ پوری نے اس کہانی کو کلکتہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار ''عبرت'' کو بھیج دیا۔ اخبار نے اس کہانی کو دو قسطوں میں شائع کیا۔ اس طرح شین کے افسانوی سفر کا باضابطہ آغاز ہوا اور پھر انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کے بعد شین مظفر پوری نے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کی غرض سے مقامی صوفی کمرشیل کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں ادب سے وابستہ چند احباب تھے، جن کی صحبت میں شین مظفر پوری کے ادبی ذوق کو جلا حاصل ہوئی۔ شین نے یہاں شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۳۹ء کا یہی وہ زمانہ تھا، جب وہ شیدا مظفر پوری سے شین مظفر پوری ہوئے اور تواتر کے ساتھ کہانیاں لکھنے لگے۔ ''بیسویں صدی'' اور ''خیام'' کے علاوہ ''شمع''، ''مست قلندر''، ''نرالی دنیا''، ''حسین دنیا'' جیسے رسالوں میں ان کی کہانیاں مسلسل شائع ہونے لگیں اور دیکھتے دیکھتے شین مظفر پوری افسانوی دنیا کا ایک مقبول نام ہو گیا۔ اس زمانے میں موصوف کی افسانہ نگاری کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ ہر ماہ آٹھ سے دس کہانیاں ضرور لکھ لیتے اور معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر بعض کہانیوں کو فرضی نام سے بھی شائع کرانے سے گریز نہ کرتے؛ مگر یہ بسیار نویسی ان کے فن کو کس طور سے مجروح کر رہا تھا اس کا اندازہ شین مظفر پوری کو نہ ہو سکا؛ کیوں کہ کچھ تو ان کی بے پرواہ طبیعت اور

کچھ ضرورت معاش نے اس جانب توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔اس پر المیہ یہ ہے کہ شین کا نہ کوئی استاد تھا، نہ رہنما، جو انہیں فن کی نزاکتوں اور تخلیق کو سنوارنے اور تراشنے کا گُر سکھتا۔ان کا فن تو ایک آبشار تھا جو پوری قوت سے پھوٹ رہا تھا اور قاری اور خود ان کی تسکین کا سامان مہیا کر رہا تھا۔

آزاد طبع شین کو سرکاری ملازمت سے بیر تھا، لہٰذا والد کی تمام کوششوں کے باوجود انہوں نے سرکاری ملازمت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صحافت کے پیشہ کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔اس زمانے میں سنبھل کے برادران جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے اور ''مرقع'' کے نام سے ایک ماہنامہ سنبھل پور ،مراد آباد سے نکالتے تھے، جس کی ادارت اور طباعت کا کام کلکتہ سے ہی انجام پاتا تھا، اس رسالے کی ادارت کی ذمہ داری شین مظفر پوری کو سونپی گئی۔یہ شین مظفر پوری کے صحافتی سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

اسی درمیان ۱۹۴۰ء میں شین مظفر پوری کی شادی آوا پور (سیتا مڑھی) میں ماسٹر جمال بخش کی صاحبزادی محترمہ زیب النسا سے کر دی گئی۔شادی کے بعد زندگی میں آئی تبدیلی نے شین مظفر پوری کو ذریعہ معاش کی جانب سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ابھی وہ کوئی فیصلہ کرتے کہ دربھنگہ سے مولوی اعجاز صاحب، وائس چیئر مین، دربھنگہ میونسپلٹی اور ان کے چند رفقا نے شین مظفر پوری کو دربھنگہ سے ایک رسالہ نکالنے پر آمادہ کر لیا۔شین صاحب کی ادارت میں ماہنامہ ''ہمالہ'' کا اجرا عمل میں آیا؛ مگر اس کے تین شمارے کی ادارت کے بعد شین مظفر پوری نے یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں ان کے معاش کا مسئلہ حل نہیں ہونے والا ہے اور بالآخر اپنے ایک دوست شاہ زادہ ایاز جو بمبئی سے ''ظفر ویکلی'' نکالتے تھے کے بلاوے پر بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۲ء کے اواخر میں بمبئی پہنچتے ہی شاہ زادہ ایاز نے حقِ دوستی ادا کی اور شین مظفر پوری کو بمبئی ٹریڈنگ اسٹور میں بطور کلرک نوکری دلوا دی، حالاں کہ یہ کام ان کے مزاج کے خلاف تھا؛ مگر معاشی پریشانی کے پیشِ نظر انہوں نے اسے قبول کر لیا۔یہاں سنٹرل بینک کی جس عمارت میں وہ قیام پذیر تھے، وہاں اسعد گیلانی کی بھی رہائش گاہ تھی، جو بینک میں ملازم تھے اور افسانے لکھا کرتے تھے۔وہیں ان کی ملاقات عصمت جاوید سے بھی ہوئی، جو اس وقت ایک اچھے افسانہ نگار کے طور پر معروف تھے۔ان دونوں حضرات سے قرب کا فائدہ یہ ہوا کہ شین صاحب نے پہلی بار افسانے کی فنی نزاکتوں اور تقاضوں کی جانب سنجیدگی سے غور کیا۔پہلی بار انہیں یہ احساس ہوا کہ افسانے لکھنا اور بات ہے اور معیاری افسانے لکھنا اور بات۔بمبئی کے ادبی حلقے اور ادبی فضا نے نہ صرف یہ کہ تخلیقی

شعور کو مہمیز کیا؛ بلکہ ان کی کہانیوں میں ایک فنی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی۔۳۵/روپئے ماہانہ کی معمولی ملازمت اور بمبئی کی زندگی، جلد ہی شین مظفر پوری نے وطن واپسی کا قصد کر لیا۔بمبئی سے واپسی کا سفر اس طرح بے حد افسوس ناک اور کرب ناک ثابت ہوا کہ پٹنہ جنکشن سے اسٹیمر پکڑنے مہندرو گھاٹ جاتے ہوئے ان کا سامان ٹم ٹم سے گر گیا، جس میں ان کی اب تک کی تمام شائع شدہ اور غیر شائع شدہ کہانیاں موجود تھیں۔تقریباً ۸۰/کہانیوں کے کھو جانے کا درد سمیٹے شین کسی طرح اپنے گاؤں پہنچے۔چند دنوں کے قیام کے بعد شین نے مظفر پور کا رخ کیا اور وہاں ٹیوشن پڑھانے کا کام کرنے لگے۔اسی اثنا اپنے علاقے کے چند لوگوں کے ہمراہ کان پور چلے آئے اور جنگی سامانوں کی سپلائی کے ادارے سی.او.ڈی میں کلرک بحال ہو گئے۔یہاں کرنیل گنج علاقے میں جناب حبیب براری (جو بعد میں بہار میں ایم ایل اے ہوئے) کے ساتھ ایک کمرے میں ان کا قیام تھا۔یہ زمانہ شین مظفر پوری کے لیے قدرے سکون اور فراغت کا تھا۔شین نے اپنی مشہور اور بدنام زمانہ کہانی ''بند کمرہ'' اسی کمرے میں تحریر کی تھی۔اس دور میں شین نے کئی اہم کہانیاں لکھیں، جو ان کے افسانوی مجموعے ''بند کمرے'' میں شامل ہیں۔کان پور میں یوں تو سب ٹھیک ٹھاک تھا؛ مگر گھر سے دوری شین صاحب کے لیے بے اطمینانی کا باعث تھی۔گھر سے قریب رہنے کی خواہش نے شین مظفر پوری کو جمال پور کی یاد دلائی، جہاں سی.او.ڈی (سنٹرل آرڈی ننس ڈپو) کا ایک ڈپو موجود تھا۔اتفاق سے یہاں ان کے برادرِ نسبتی جناب محمد مسلم بھی ریلوے میں ملازم تھے۔ایک انگریز افسر کے توسط سے انہوں نے کان پور ڈپو کو خیر باد کہا اور جمال پور (مونگیر) ڈپو میں بحال ہو گئے۔جمال پور آنے کے بعد شین مظفر پوری اپنے برادر نسبتی کے ساتھ ریلوے کوارٹر میں مقیم رہے اور دیکھتے دیکھتے ایک ادبی حلقہ بھی قائم کر لیا۔یہاں احمد مونگیری کے ساتھ مل کر انہوں نے ''وارفتگانِ ادب'' کی ایک یادگار نشست بھی منعقد کی تھی، جس میں کلکتہ سے بطور خاص افسر ماہ پوری بھی شریک ہوئے تھے۔ایک سال سے بھی کم عرصے پر محیط اپنے جمال پور قیام کے دوران انہوں نے کئی یادگار افسانے تخلیق کیے، جن میں ''چوٹ کھائی ہوئی ناگن'' نے خاصی شہرت حاصل کی۔

جمال پور سے ترک ملازمت کے بعد شین مظفر پوری نے ایک بار پھر کلکتہ کا رخ کیا۔کلکتہ ان کے لیے نیا نہیں تھا اور وہ دنیائے ادب میں ایک مقام حاصل کر چکے تھے، لہٰذا یہاں انہیں بغیر کسی پریشانی کے ''نقاش ویکلی'' میں بحیثیت مدیر جگہ مل گئی۔ابھی چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اخبار

کے مالک سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا، نتیجتاً وہ نئے موقع کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ جلد ہی دہلی سے ایک فلمی و نیم ادبی رسالہ ''آرٹسٹ'' کی جانب سے انہیں ملازمت کا آفر ملا اور ۱۹۴۶ء کے اوائل میں شین نے دہلی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

دہلی میں شین مظفر پوری کا قیام رسالہ آرٹسٹ کے دفتر میں رہا، جو بلّی ماران گلی قاسم جان میں واقع ایک عمارت کے بالائی منزل پر تھا۔ اس رسالہ کے ایڈیٹر و مالک کے طور پر جناب رفیق چمن دہلوی کا نام شائع ہوتا تھا؛ مگر اصل ادارت شین مظفر پوری کی تھی۔ اس وقت دہلی سے درجنوں فلمی رسالے شائع ہو رہے تھے۔ ان کے درمیان معاصرانہ چشمک اور پیشہ ورانہ رقابت بھی خوب چلتی تھی۔ تین رسالوں: ''شمع''، ''فلم لائٹ'' اور ''کہکشاں'' کے درمیان رقابت کی یہ آنچ کچھ زیادہ تیز تھی۔ ابھی چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ بقول شین ''عیسیٰ خاں نے اپنے رسالہ ''فلم لائٹ'' کے لیے مجھے وہاں سے گویا اچک لیا۔'' (''رقصِ بسمل''، ص ۲۱) عیسیٰ خاں دراصل رفیق چمن دہلوی کے رشتہ دار تھے اور گلی قاسم جان کے نکڑ پر ان کے رسالہ ''فلم لائٹ'' کا دفتر تھا۔ اب شین کا نیا ٹھکانہ اسی دفتر کا ایک کمرہ تھا۔ یہاں شین مظفر پوری رسالے کی ادارت کے علاوہ مشہور فلمی ہیروئن ثریا کے نام سے افسانے بھی لکھنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ قصہ یوں ہے کہ فلم لائٹ کے مالک ثریا کے عاشق تھے۔ یک طرفہ عشق میں پاگل عیسیٰ خاں غزنوی ثریّا کے نام سے کہانیاں شائع کر کے اپنے نا آسودہ جذبات کو تسکین پہنچانے کا جواز فراہم کرتے تھے۔ اس زمانے میں شین نے بے طرح افسانے لکھے۔ پیسے کی خاطر کچھ افسانے فرضی ناموں سے بھی لکھتے رہے۔ ان افسانوں کی تعداد اتنی ہو چکی تھی کہ انہوں نے بیک وقت اپنے تین افسانوی مجموعے ''آوارہ گرد کے خطوط''، ''دُکھتی رگیں'' اور ''کڑوے گھونٹ'' کو ترتیب دیا اور اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''آوارہ گرد کے خطوط'' نیا کتاب گھر، دہلی سے شائع بھی کروایا۔

دہلی میں شین مظفر پوری کی زندگی ایک ڈھرّے پر خوش و خرم اور رواں دواں تھی کہ تقسیم ہند کا سانحہ رونما ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے پورا ہندوستان فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جل اٹھا۔ دلی بھی اس سے اچھوتا نہ رہا۔ پرانی دلی کے حالات مزید خراب ہو گئے۔ جان پر بن آئی تو شین مظفر پوری جان بچا کر پاکستان جا رہے ایک قافلے کے ہمراہ کسی طرح لاہور پہنچ گئے۔

سفر پاکستان: دہلی سے لاہور تک کا ۷۲ گھنٹوں سے بھی زیادہ کا سفر کس قدر اذیت ناک اور کرب ناک تھا۔ اس کا مفصل ذکر شین مظفر پور نے اپنی یادداشت ''رقصِ بسمل'' میں کیا ہے۔

اجنبی ملک، اجنبی شہر اور دیارِ غیر میں شین نے اپنے چند پرانے دوستوں اور شناساؤں کی مدد سے سر چھپانے اور دو وقت کی روٹی کا بندوبست کیا۔ ان احباب میں عبدالرحیم شبلی ایم۔ کام اور قمر تسکین کا نام اہم ہے۔ شبلی ''عالم گیر'' اور ''خیام'' جیسے رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ تمام تر آزمائشوں کے باوجود شبلی نے دوستی کا حق ادا کیا اور شین مظفر پوری کی اس وقت تک کفالت کی، جب تک انہوں نے روزگار کی سبیل نہ نکال لی۔ قمر تسکین، شین کے مداحوں میں تھے اور لاہور کے ادبی حلقے میں ان کی حیثیت LIASION MAN کی تھی۔ ان کے توسط سے شین صاحب کی ملاقات ان تمام ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی، جو اس وقت اور بعد میں آسمان ادب کے آفتاب و مہتاب قرار پائے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک، احمد راہی، ظہیر کاشمیری، شورش کاشمیری اور عبدالحمید عدم، ساحر لدھیانوی اور حاجی لق لق کے نام اہم ہیں۔

اس درمیان شین مظفر پوری کے دیرینہ رفیق، رفیق چمن دہلوی نے ''مسلم'' اور ''نور جہاں'' کے نام سے روزنامہ اور ہفتہ وار اخبار نکالنا شروع کیا۔ شین مظفر پوری ایک بار پھر ان اخبارات کی ادارت کے ذمہ دار ٹھہرے؛ مگر جلد ہی یہ اخبار اقتصادی بحران کا شکار ہو گیا اور شین بے کار ہو گئے۔ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی اور شین صاحب مقروض ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے لاہور چھوڑ کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا، جہاں سے خلیق دہلوی بار بار آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

کراچی میں شین مظفر پوری کا قیام میکلوڈ روڈ پر واقع روزنامہ ''جنگ'' کے دفتر سے متصل ایک کمرے میں تھا۔ دراصل یہ کمرہ رسالہ ''مضراب'' کا دفتر تھا۔ ابتدا میں چند ماہ تک شین نے ''جنگ'' کے دفتر میں بھی کام کیا؛ مگر جلد ہی ''مضراب'' کی ادارت میں جٹ گئے کہ جن کے لیے آپ کو کراچی بلایا گیا تھا۔ ''مضراب'' کے مالکان اسے ایک فلمی رسالہ کے طور پر شائع کرنا چاہتے تھے؛ مگر شین نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ''نقوش''، ''سویرا'' اور ''ادب لطیف'' پر پابندی عاید ہو جانے کی صورت میں اسے ترقی پسند ادبی رسالہ کے طور پر شائع کیا جائے؛ تا کہ وہ ان رسالوں کی جگہ لے لے۔ اگست ۱۹۴۸ء میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔ شین مظفر پوری کی ادارت میں اس کے صرف تین شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد شین نے اپنے وطن ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ کراچی کے دوران قیام فراغت اور یکسوئی کے لمحے میسر ہوئے تو شین نے کئی یادگار افسانے تحریر کیے، جن میں ''زہر''، ''دستک'' اور ''ایک اجنبی لاہور میں'' شامل ہیں۔ ''دستک'' کو پہلی بار کراچی کے ہی

ایک ادبی محفل میں شین صاحب نے پڑھا تھا اور اس محفل میں ابن انشا، شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، آوارہ، طفیل احمد جمالی، عزیز اثری، قمر ہاشمی، سالک الہاشمی، مسعود گوہر وغیرہ موجود تھے۔

حالات سازگار ہونے اور آمد و رفت کی سہولت دستیاب ہو جانے کے بعد ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو بذریعہ سمندری جہاز شین کراچی سے روانہ ہو کر ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو بمبئی پہنچے اور اسی شام دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ سالِ نو کی دوسری صبح یعنی ۲ر جنوری ۱۹۴۹ء کو شین واپس جامع مسجد کی ان ہی گلیوں میں موجود تھے، جہاں سے جان بچا کر وہ ایک اجنبی ملک کو چلے گئے تھے۔

۲ر جنوری سے پانچ جنوری تک شین نے پرانی دلّی کی ان گلیوں اور شاہراہوں کی خاک چھانی، جہاں انہوں نے برسوں شب و روز گزارے تھے؛ مگر اس بار دلّی وہ دلّی نہیں تھی؛ بلکہ عمارتوں اور سڑکوں کے علاوہ سب کچھ بدل چکا تھا، لوگ بدل چکے تھے، تہذیب بدل چکی تھی، آداب بدل چکے تھے۔ ان تین دنوں میں شین نے یہاں اپنے مستقبل کے امکانات تلاشنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس سعی میں انہوں نے ''بیسویں صدی'' کے ایڈیٹر لالہ رام رکھا مل (خوشتر گرامی) سے ملاقات کی جو پاکستان سے ہجرت کر کے دہلی آ بسے تھے اور یہاں سے ''بیسویں صدی'' کا اجرا کر چکے تھے۔ خوشتر گرامی جنہوں نے ان کا افسانوی مجموعہ ''دہکتی رگیں'' شائع کیا تھا نے کتاب کا معاوضہ بھی دیا اور ان کی مالی معاونت بھی کی۔ ۵ر جنوری کو دہلی سے پٹنہ اور پٹنہ سے دربھنگہ ہوتے ہوئے ۱۱ر جنوری کو اپنے گاؤں باتھ اصلی لوٹ آئے، جہاں ان کے بغیر والد محترم کا وجود سراپا انتظار بن چکا تھا۔

پاکستان سے واپسی کے بعد شین اپنے گھر پہ مقیم رہنا چاہتے تھے؛ مگر گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد ہی انہوں نے کلکتہ کا رخ کیا۔ کلکتہ ان کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ سب کچھ ان کا جانا پہچانا اور سب کے وہ جانے پہچانے، لہٰذا فوراً انہیں ''کارواں'' کی ادارت مل گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی وابستگی ''عصر جدید'' سے ہو گئی؛ لیکن ان دونوں جگہوں پر معاوضہ کم تھا، لہٰذا انہوں نے مارچ ۱۹۵۱ء میں بڑھی ہوئی تنخواہ پر ''آزاد ہند'' جوائن کر لیا۔ بطور نیوز ایڈیٹر انہوں نے ۱۹۵۴ء تک یہاں کام کیا۔ یہاں ان کی ادبی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ کئی اہم کہانیاں اور مشہور ناول ''ہزار راتیں'' اسی زمانے کی دین ہیں۔

اسی درمیان کلکتہ سے چھٹیوں پر گاؤں آئے تو کسی کیس میں ملوث کر دئے گئے اور مجبوراً اس سے بری ہونے کے لیے کئی ماہ گھر پر ہی رہنا پڑا۔ ''آزاد ہند'' کی نوکری جاتی رہی۔ بالآخر روزی روٹی

کی تلاش میں پہلے دہلی اور بعد میں کانپور گئے۔ کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ آخر میں ایک بار پھر کلکتہ ہی جائے اماں ٹھہرا۔ اس بار ''اخوت'' نامی اخبار میں بطور ایڈیٹر کام ملا۔ یہاں اس وقت مشہور ناقد وہاب اشرفی مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے؛ مگر کچھ دنوں کے بعد ہی وہاب اشرفی پٹنہ چلے گئے۔ اس بار شین صاحب کے لیے بھی کلکتہ میں کشش نہ تھی۔ نتیجتاً شین نے جلد ہی پٹنہ کو اپنے مستقل اور مستقبل کا ٹھکانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۵۹ء میں اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے وہ پٹنہ چلے آئے، جہاں وہاب اشرفی ''صنم'' کی ادارت سے منسلک تھے۔ شین کا نیا ٹھکانہ ''صنم'' کا دفتر بنا اور یہیں سے انہوں نے اپنا اخبار پندرہ روزہ ''ہمارا بہار'' نکالا، جو بعد میں ہفت روزہ ہو گیا۔ شین نے اس اخبار کے ذریعہ صحافت کا جو معیار و مزاج متعین کیا، وہ ان کی مقبولیت اور عظمت کا ضامن بنا۔ وہاب اشرفی کے گیا چلے جانے کے بعد شین مظفر پوری ''صنم'' کے باضابطہ ایڈیٹر ہو گئے۔

''صنم'' کے بند ہو جانے کے بعد شین نئی راہیں تلاش رہے تھے کہ پٹنہ کے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر سعید اختر نے ان کی کہانی ''تین لڑکیاں ایک کہانی'' پر فلم بنانے کی تجویز رکھی اور شین صاحب سے اس کہانی کو فلم کے اسکرپٹ میں تبدیل کر دینے کی گذارش کی۔ اس کام کے لیے انہوں نے اچھے معاوضے اور بمبئی میں قیام و طعام کا نظم بھی کیا۔ شین صاحب نے بمبئی جا کر اپنا کام تو کر دیا؛ مگر بدقسمتی سے فلم پوری نہ ہو سکی۔ اس کام سے فراغت پا کر شین مظفر پوری نے ایک بار پھر دہلی کا رخ کیا اور ہفتہ وار ''پرچم ہند'' اور ''ملک و ملت'' کی ادارت سے وابستہ رہے۔ ان اخبارات کے مالک انیس دانا پوری کی بے دینی اور بدمزاجی سے نالاں ہو کر جون ۱۹۶۷ء میں ایک بار پھر پٹنہ آ گئے۔ پٹنہ میں کچھ دنوں تک ''پندار'' اور ''سنگم'' کی ادارت سے وابستگی کے بعد ''سنگم'' نے اپنے کلکتہ ایڈیشن کا سربراہ اور ایڈیٹر بنا کر ان کو کلکتہ بھیج دیا، جہاں تقریباً ایک سال رہنے کے بعد وہ واپس پٹنہ آ گئے۔

۱۹۷۳ء میں سابق وزیر اعلیٰ بہار جناب عبدالغفور نے ایک ہفتہ وار نکالنے کا منصوبہ بنایا تو شین صاحب کا انتخاب بطور ایڈیٹر کیا۔ اس طرح تقریباً دو سالوں تک ''قومی دھارا'' کے عنوان سے آپ نے یہ اخبار نکالا۔ اسی درمیان اگست ۱۹۷۵ء میں بہار اردو اکادمی کے ادبی ترجمان رسالہ ''زبان و ادب'' کے مدیر مقرر کئے گئے۔ شین صاحب کی ادارت میں ''زبان و ادب'' نے ایک معیاری ادبی رسالے کے طور پر نہ صرف ملک؛ بلکہ بیرون ملک بھی اپنا ایک مقام بنایا؛ مگر اکادمی کی اندرونی سیاست کا شکار ہو کر یکم فروری ۱۹۸۳ء کو ان کی ملازمت کی معیاد ختم کر دی گئی اور صوبے کے

اکثر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی خواہش کے باوجود ان کی ملازمت میں توسیع نہیں کی گئی، جس کا صدمہ شین کو آخری دم تک رہا۔

اکادمی سے سبکدوشی کے بعد ایک عرصے تک شین مظفر پوری کا قیام پٹنہ میں رہا۔ پٹنہ مارکیٹ سے سبزی باغ کی جانب بڑھنے پر حبیبیہ ہوٹل کی بغل والی گلی میں واقع ''نواب لاج'' ان کا مسکن تھا۔ لاج کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف چوکی اور سرہانے میں کتابوں کا ڈھیر، ایک بکس اور کھونٹی سے ٹنگے چند کپڑے۔ یہی تھا ان کا کل اثاثہ۔ اس زمانے میں بلا ناغہ ان کی شام پروفیسر اسلم آزاد، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کی رہائش گاہ (روشن آرا بلڈنگ، مراد پور لین) پر گزرتی، جہاں ان کے علاوہ جناب شاہ مشتاق احمد (سابق ایم.ایل.اے و سابق سکریٹری، بہار اردو اکادمی) بھی ہوتے۔ کبھی کبھی جناب بیتاب صدیقی اور جناب تقی رحیم بھی اس ٹکڑی میں شامل ہو جاتے۔ راقم الحروف کو اسی زمانے میں شین مظفر پوری کو بے حد قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ دبلا پتلا جسم، نکلتا قد، سفید بال، صاف رنگ، چہرے پہ ہلکی داڑھی اور آنکھوں پر موٹے فریم کی عینک، کرتا پائجامہ اور بنڈی زیب تن کئے اور لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ سجائے (جسے آپ ''ادھوری مسکراہٹ'' بھی کہہ سکتے ہیں) شین کو میں نے ایک مخلص اور بے ضرر انسان پایا۔ انا اور خودداری سے متصف شین کی پوری زندگی سراپا حسرت رہی۔ اس کا اندازہ شین کے اس جملہ سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے راقم الحروف کے ساتھ پٹنہ مارکیٹ سے اکادمی کے دفتر جاتے ہوئے ایک بڑی دکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''ان دکانوں کے شوکیس میں ہماری آرزوئیں اور حسرتیں بند ہیں۔''

شادیاں اور اولادیں: شین مظفر پوری کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی شادی ۲۰؍سال کی عمر میں زیب النساء عرف زینب سے ہوئی، جو ان کی سوتیلی ماں کی بھتیجی تھیں۔ ان کے والد کا نام جمال بخش تھا اور وطن آوا پور، ضلع سیتا مڑھی تھا۔ زیب النساء سے چھ اولادیں ہوئیں۔ تین بیٹیاں: نرگس خاتون، ریحانہ خاتون اور مہ جبیں خاتون اور تین بیٹے: ابرار احمد، انصار احمد عرف جان عالم اور اسرار احمد۔

دوسری شادی ۱۹۵۷ء میں ۳۶؍سال کی عمر میں ہوئی۔ عقد ثانی پہلی بیوی کی حیات میں ان کی اجازت سے اس وقت ہوئی، جب وہ طویل بیماری کی وجہ سے ذی فراش تھیں۔ دوسری بیوی کا نام کفیلہ خاتون تھا، جو شیخ ظہور الدین صاحب، دیورا بندھولی، ضلع دربھنگہ کی صاحب زادی تھیں۔

ان سے تین اولادیں ہوئیں۔ دو بیٹے: ارمان احمد اور آفتاب احمد اور ایک بیٹی: شکیلہ خاتون۔

آخری ایّام: شین مظفر پوری ۱۹۹۴ء میں حتمی طور سے پٹنہ چھوڑ کر اپنے آبائی وطن باتھ اصلی آ گئے۔ اب ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ یہاں آ کر تخلیقی و تحریری کام بھی کافی متاثر ہوا۔ بیماری کی وجہ سے لکھنا پڑھنا تقریباً ختم ہو گیا، البتہ بعض احباب کو خطوط ضرور لکھتے اور آئے ہوئے خطوں کے جواب بھی دیتے۔ ناتواں جسم اور معاشی کمزوری دونوں نے مل کر شین کے آخری ایام کو قابلِ رحم بنا دیا تھا۔ بالآخر ۱۴؍اگست ۱۹۹۶ء کو دنیائے علم و ادب کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ گاؤں کے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

افسانہ نگاری

شین مظفر پوری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۳۶ء میں افسانہ نگاری سے کیا۔مختلف اصناف ادب میں انہوں نے انمٹ نقوش چھوڑے؛مگران کی پہلی اور آخری پسند کہانیوں سے ہی ان کی شناخت تھی، ہے اور ہمیشہ رہے گی۔شین نے ۳۰۰ سے زاید کہانیاں لکھیں، جوان کے دس افسانوی مجموعوں کے علاوہ ہندو پاک کے مختلف رسائل وجرائد میں بکھری پڑی ہیں۔فرضی ناموں اوردوسروں کے لیے(پیسوں کی خاطر)تحریر کردہ افسانوں کو شامل کرلیں تو یہ تعداد ۴۰۰ سے تجاوز کر جائے گی۔شین کے افسانوں پرگفتگو سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظران کے افسانوی مجموعوں پر ڈال لیا جائے، جواس طرح ہیں:

(۱)**آوارہ گرد کے خطوط**: یہ شین مظفر پوری کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جوشین مظفر پوری کے مطابق ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔کتاب میں سن اشاعت درج نہیں ہے؛مگر ''رقصِ بسمل'' (خودنوشت) میں انہوں نے مجموعہ کی اشاعت کا سال ۱۹۴۶ء لکھا ہے،مکتبہ ادب،اردو بازار، جامع مسجد، دہلی سے شائع اس مجموعہ کی قیمت ڈھائی روپے اور مصنف کا نام 'ش.مظفر پوری' درج ہے،بلقیس فاطمہ مظفر پوری نے اس کا مقدمہ تحریر کیا ہے اوراس میں کل دس افسانے شامل ہیں،جن کے نام ہیں: (۱) آوارہ گرد کے خطوط(۲)انّو آپا(۳)چارہ گر(۴)لال بی بی(۵)بند کمرہ(۶)نئ آغوش(۷)حق تلفی(۸)خارش(۹)ایک عورت(۱۰)فاحشہ

نوٹ: یہی افسانوی مجموعہ ''بند کمرہ'' کے عنوان سے دوبارہ شائع ہوا۔اسی بنیاد پر بعض حضرات شین کے افسانوی مجموعوں کی تعداد گیارہ قرار دیتے ہیں، جوحقیقت سے پرے ہے۔

(۲)**دکھتی رگیں**: یہ دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، جو۱۹۴۹ء میں رسالہ بیسویں صدی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔اس مجموعہ میں بھی سن اشاعت درج نہیں ہے،البتہ خوشتر گرامی (ایڈیٹر بیسویں صدی) کے تحریر کردہ ''پیش لفظ'' میں یکم جولائی ۱۹۴۹ کی تاریخ درج ہے،جس سے سن اشاعت کا اندازہ ہوتا ہے۔مصنف کا نام 'جناب ش.مظفر پوری' طبع ہے اور قیمت دو روپے ہے۔مجموعے میں شامل ۱۴/افسانوں کے نام یوں ہیں:(۱) ٹھنڈک (۲) دکھتی رگیں(۳) وہ آنکھیں(۴)بلیک آوٹ(۵)تلافی(۶)ریت کا محل(۷)آستین کا سانپ(۸)میری اوراس کی ضد(۹)پچھتاوا(۱۰)موسم کا تقاضا(۱۱)سرنگ(۱۲)کاجل(۱۳)سزا(۱۴)بھیک۔

(۳)**کڑوے گھونٹ**: ۱۹۴۹ء میں شائع یہ تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔شامل افسانے:(۱)ایک عورت کی خاطر(۲)خسارہ(۳)بے زبان(۴)بنگال کا جادو(۵)گیتی آرا(۶)لاڈلی(۷)کاجل(۸)معاوضہ(۹)دستک(۱۰)جراثیم

(۴)**لڑکی جوان ہو گئی**: یہ شین مظفر پوری کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔۱۹۵۶ء میں شائع اس مجموعے میں بارہ افسانے شامل ہیں۔'آخری سال'،'یہ بھی ایک افسانہ ہے'اور'جیت'اس مجموعے کے یادگار افسانے ہیں۔

(۵)**دوسری بدنامی**: شین مظفر پوری کا پانچواں افسانوی مجموعہ'دوسری بدنامی' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔مکتبہ نئ زندگی، نئ دہلی کے زیرِ اہتمام شائع اس مجموعے میں کل چھ افسانے شامل ہیں۔عنوان اور ترتیب اس طرح ہے:(۱)دوسری بدنامی(۲)نازک بات(۳)عورت کا تیسرا جنم (۴)۳۱/مارچ(۵)ایک شام(۶)نفرت۔

(۶)**حلالہ**: شین مظفر پوری کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے، جومئی ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ۱۹۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں کل ۱۵ افسانے شامل ہیں۔کتاب کی قیمت دس روپے ہے اوراس کا پیش لفظ ''بر سبیل تذکرہ'' کے عنوان سے جناب مظہر امام نے لکھا ہے۔شامل افسانوں کے عنوان اس طرح ہیں:(۱)حلالہ(۲)اے بسا آرزو(۳)اچھی بیٹی برا آدمی(۴)ثبوت(۵)آبرو(۶)دودھ کا جلا(۷)سیکنڈ ہینڈ وائف(۸)دلّی دور ہے(۹)دوسرا رخ

(۱۰) سرکس کا شیر (۱۰) سہارا (۱۲) بدصورت (۱۳) قانون کی بستی (۱۴) انمول (۱۵) چہرے کی تلاش۔

(۷) **طلاق طلاق طلاق**: یہ افسانوی مجموعہ بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا،اس کے ناشر خود مصنف ہیں۔مجموعے میں شامل ۲۰ کہانیوں کے عنوانات اس طرح ہیں:(۱) ماجرا جو گزر گیا (۲) طلاق طلاق طلاق (۳) آندھی تیز ہے (۴) آسمان شرمندہ ہے (۵) بازار مندہ ہے (۶) ایک سچی کہانی (۷) نشی ڈارلنگ (۸) ودیا نگر کی مسجد (۹) آج کی تازہ خبر (۱۰) چراغ، چہرہ، سایہ (۱۱) چمپا چمیلی کا راون (۱۲) لچکا (۱۳) سہارا (۱۴) کسی سے کہنا نہیں (۱۵) سرخ لہو سفید دودھ (۱۶) دوسرا رخ (۱۷) کینسر کینسر (۱۸) دومونہا سانپ (۱۹) حق بہ حقدار (۲۰) حلالہ۔

(۸) **قانون کی بستی**: ۱۹۸۹ء میں شائع یہ افسانوی مجموعہ شین مظفر پوری کا آٹھواں مجموعہ ہے۔فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی،حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع اس کتاب کے ناشر خود شین مظفر پوری ہیں۔کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے اور اس میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں ،جن کے عنوان یہ ہیں:(۱) قانون کی بستی (۲) جھٹکا (۳) زہر مار (۴) گرم راکھ (۵) عذاب (۶) کتا جو دانشور تھا (۷) آدھی عورت (۸) مور کے پاؤں (۹) مرہم (۱۰) سرخاب کا پر (۱۱) کیا جینا کیا مرنا

(۹) **نئی الف لیلہ**: یہ شین کا نواں افسانوی مجموعہ ہے جو جولائی ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔اس کے ناشر خود مصنف ہیں اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کا مالی تعاون اس کی اشاعت میں بھی شامل ہے۔کتاب کی قیمت ۲۹/روپے ہے۔جن سات افسانوں سے یہ مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے،ان کے نام یوں ہیں:(۱) نہ جینے دوگے نہ مرنے دوگے (۲) چاندنی (۳) دوسری بدنامی (۴) نئی الف لیلہ (۵) سرد جنگ (۶) بھگوان کی اچھا (۷) لچکا۔

(۱۰) **کسی سے کہنا نہیں**: یہ شین مظفر پوری کا دسواں اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ جون ۱۹۹۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے شائع اس مجموعے میں کل ۱۴ افسانے شامل ہیں اور اس کی قیمت ۲۲ روپے ہے۔افسانوں کے نام اور ترتیب اس طرح ہیں:(۱) پیاسا خنجر (۲) کسی سے کہنا نہیں (۳) لاشوں کا ہنی مون (۴) عورت کا تیسرا جنم (۵) اچھی بیٹی برا آدمی (۶) ایک خطرہ اور (۷) عورت تیرے کتنے روپ (۸) گالی (۹) دل کا معاملہ (۱۰) شریف آدمی (۱۱) آؤٹ آف ڈیٹ (۱۲) کجری (۱۳) اجنبی خوشبو (۱۴) دل کا چور۔

شین کی افسانہ نگاری پر ایک نظر:

شین مظفر پوری کے افسانوی جہات کی تفہیم میں جو بات ہمیشہ مانع رہی، وہ ان کی جنس نگاری ہے۔ابتدائی دور میں لکھے ان کے افسانے اور فلمی، یا نیم ادبی رسالوں میں تواتر کے ساتھ ان کی اشاعت نے شین کو مقبولیت تو بہت دلائی ؛مگر جنسی افسانہ نگاری کا ایک لیبل جوان کے فن کے ساتھ چسپاں ہو گیا، وہ ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی ان کے اصل ادبی مقام کے تعین میں آڑے آتا رہا؛ مگر اسے المیہ ہی کہا جائے گا کہ ان کی موت کے ربع صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کی تخلیقات کا تفصیلی اور تنقیدی مطالعہ نہیں پیش کیا جا سکا ہے۔بعض اہم ناقدین نے شین کے تعلق سے راہ پا گئی ،اس آرا کو سرے سے خارج کر دیا ہے،جس کی رو سے شین کے افسانوی سرمایے کو ’جنس زدہ‘ کہہ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔اس کے باوجود شین مظفر پوری کے فن کی عظمت سے ناقدین کا اجتناب ادبی بددیانتی ہی کہی جائے گی۔

شین مظفر پوری کے افسانوں میں جو تخلیقی تنوع ہے، وہ قاری کو متحیر بھی کرتا ہے اور ان پر عاید جنس زدگی کے الزام کی نفی بھی کرتا ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ شین نے جن بنیادی عناصر کی مدد سے اپنے فن کی خمیر تیار کی، ان میں جنس کو مرکزیت حاصل ہے؛ مگر اس بنیاد پر ان کے افسانوں کو رد کر دینا قطعی مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا کے بہترین افسانوں میں ان افسانوں کو اوّلیت حاصل ہے، جو جنس کے موضوع پر لکھے گئے ہیں؟ خود ہمارے یہاں سعادت حسین منٹو اس کی مثال ہیں، جب منٹو کی اس پس منظر میں لکھی گئی کہانیاں ہمارے آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں تو شین کے افسانوں میں فنی عظمت کی تلاش کیوں کر بے معنی ہے؟ منٹو اور شین کا تقابل میرا مقصد قطعی نہیں ہے؛ مگر ایمان داری کے ساتھ شین کے یہاں موجود ان فنی کمالات کا جائزہ ضرور لیا جانا چاہیے، جس کی مدد سے شین نے ہمارے معاشرتی زوال پر کاری ضرب لگائی ہے۔

شین مظفر پوری کے اندر کہانی لکھنے کا ذوق فلمیں دیکھ دیکھ کر پیدا ہوا۔فلمی کہانیوں سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری کی ابتدا کرنے والے نوجوان سے ”انو آپا“ جیسی کہانی کی تخلیق غیر فطری نہیں ہے، پھر یہ کہ ایسی کہانیاں لکھنا شین کی مجبوری بھی تھی۔معیاری ادبی رسالے اور خالص ادبی نوعیت کے قصے شین کو درپیش ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ایسے میں فلمی اور نیم ادبی رسالے ہی کسب معاش کا

ذریعہ بنے۔ بیک وقت پیسہ اور شہرت کی حصولیابی نے جانے انجانے شین کو تخلیق کے اس ڈگر پر ڈال دیا، جہاں جنس نگاری کی ریل پیل تھی؛ لیکن شین کے اس نوع کے افسانوں کو فحش کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہمارے آس پاس، ہمارے گھر، ہمارے معاشرے اور ہماری مہذب دنیا میں ایسے نہ جانے کتنے واقعات وحادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں، جس سے ہم محفوظ تو ہوتے ہیں؛ مگر معیوب بھی تصور کرتے ہیں۔ شین نے زندگی کے ان ہی تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ ''آوارہ گرد کے خطوط'' میں شامل افسانوں کے حوالے سے شین کی جنس نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مشہور ناقد پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''میں تو ان افسانوں کو بھی فحش افسانے نہیں سمجھتا۔ فحش نگاری کس کو کہتے ہیں؟ اس باب میں خاصی بحث کی گنجائش ہے، جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ البرموروایا کی ''دی وومن آف روم'' کو فخر سے پڑھنے والے لوگ شین کو فحش نگار کہتے ہیں۔ شین جنس پر لکھتے ہیں تو حصول لذت کے لیے نہیں، وہ ماحول اور سماج کی تمام تر گندگیوں کو ایک فن کار کی طرح دیکھتے ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر دیتے ہیں، یہ جراحی ناپسندیدہ ہو سکتی ہے؛ لیکن غیر ضروری نہیں۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری)

وہاب اشرفی کا یہ کمنٹ نہ صرف حقیقت پر مبنی ہے بلکہ شین کے حوالے سے پھیلی گمراہی کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ 'بند کمرہ' اور 'حق تلفی' کا مطالعہ کریں تو جنس زدگی کا الزام لگانے والوں کی کج فہمی پر ماتم کرنے کا جی چاہتا ہے۔ 'بند کمرہ' کچی عمر کی نازو کے معصوم ذہن میں اٹھنے والے 'سوالات' اور ان سے پیدا ہونے والی الجھنوں کے رفتہ رفتہ عنفوان شباب کی منزلوں میں قدم رکھنے کے ساتھ فطری طور پر بنا کسی کے بتائے جواب مل جانے کی کہانی ہے۔ یہ نفسیات کی وہ کہانی ہے، جہاں کتاب عشق کے مطالعے کے بغیر ہی انسان عشق کی منزلوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ کہانی کا آخری حصہ جہاں نازو اور فاروق نے اس آگہی کا عملی تجربہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، فنی لحاظ سے ذرا کمزور ضرور ہے؛ مگر اس حصے کی بنت میں بھی شین نے کہانی کو تلذذ اور عریانیت کی سطح سے اوپر رکھا ہے۔ 'حق تلفی' میں رسالے کے مدیر کے اندر جنسی خواہشات کا بیدار ہونا اور بعض اوقات اس کا شدید تر ہو جانا ایک نفسیاتی کیس ہے، جس کا خوبصورت مطالعہ شین نے پیش کیا ہے۔ 'بند کمرہ' کے برعکس

یہاں جنسی پیش کش میں اشارات وعلامات سے مدد لی گئی ہے، جو جنس پر لکھی گئی کہانیوں کو فحش نگاری کے زمرے سے اوپر رکھتی ہے۔ شین کی اس کہانی کا سرا کہیں نہ کہیں منٹو کی کہانیوں سے ملتا ہے۔

محمد حسن عسکری کے اس قول کو نگاہ میں رکھیں کہ!

> ''فحش اور آرٹ کی سب سے نفیس پہچان یہ ہے کہ فحش سے دوبارہ ہم وہی لطف نہیں لے سکتے جو پہلی مرتبہ حاصل کیا تھا۔ آرٹ ہر مرتبہ نیا لطف دیتا ہے۔''

تو جنس پر مبنی شین کی کہانیوں کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ چند کہانیوں کو چھوڑ کر ان کی بقیہ تمام کہانیاں بہترین آرٹ کے زمرے میں آتی ہیں اور ان کا مطالعہ ہر مرتبہ ایک نئی لذت سے آشنا کرتا ہے۔

موضوعات ومسائل کا جو تنوع شین مظفر پوری کی کہانیوں میں موجود ہے، وہ ان کے ہم عصروں میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی، ان کے مسائل ومعاملات معاشی اور سماجی الجھنیں ان کے محبوب موضوعات ہیں؛ مگر ان موضوعات میں جو وسعت اور رنگارنگی ہے، زندگی کے مختلف شیڈس اور جہتیں نمایاں ہیں، وہ شین کی تخلیقی بصیرت کا پتہ دیتی ہیں۔ ''دستک''، ''آخری سال''، ''بنگال کا جادو''، ''بازار مندا ہے''، ''سرد جنگ''، ''نیا سفر''، اور ''کڑوے گھونٹ'' جیسے افسانے ملک کی ایک بڑی آبادی، ان کی بے چارگی، ان کے دکھ درد اور آہ وفغاں کے وہ نغمے ہیں جسے تخلیقی آہنگ عطا کر کے شین نے انقلاب کے گیت بنا دیئے ہیں۔ یہ آواز بظاہر کمزور لگتی ہے؛ مگر اپنے اندر ایوان سیاست کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کہانیوں کا سب سے اہم پہلو اس کی رجائیت ہے، جو اس کو ایک جاودانی عطا کرتی ہے۔ ''دستک'' کا ایک اقتباس دیکھئے:

> ''گاڑی تیسرے گاؤں سے نکل کر چوتھے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی، اس کے بعد اسٹیشن تھا۔ گاڑی بان 'بارہ ماسہ' گاتے گاتے تھک کر چپ ہو چکا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف نگاہ کی آخری پہنچ تک دھان کے ہریالے پودے لہلہا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے درخت کے نیچے ایک بکرے کو ذبح کر کے الٹا لٹکا دیا گیا تھا اور اس کے قریب ہی ایک تندرست کتا زمین پر بہے ہوئے گاڑھے خون کو بڑی رغبت سے چاٹ رہا تھا۔ کتا کتنا خوبصورت اور صحت مند تھا۔ روئیں روئیں میں ہمواری اور چمک، جسم بھرپور اور موزوں۔ وہاں جو لوگ کھڑے تھے، ان سب سے کتا زیادہ تندرست تھا، چند کمزور کتے الگ کھڑے ہوئے چمکتے ہوئے لہو کو للچائی نظر سے دیکھ رہے تھے، ان کی ذرا سی حرکت پر

ہر شہ زور کتا دانت نکوس کر غرانے لگتا تھا۔ یہ کتا اس قدر تندرست اور خوبصورت اس لیے تھا کہ اس نے مذبح میں پرورش پائی تھی۔ وہ صرف خون چاٹتا تھا، غذاؤں غذاؤں کا ست، بالکل، ساہوکار کی طرح۔ یہ دونوں خون پیتے تھے۔ ایک جانور کا دوسرا انسان کا؛ لیکن کہتے ہیں کہ مذبح کے کتوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے؛ کیوں کہ خون کی نا مطلوب فراوانی سے ان کے پھیپھڑے سڑ جاتے ہیں۔

ساہوکار کے پھیپھڑے بھی سڑ جائیں گے، جو خون وہ سونے کی نلکی کے ذریعہ کشید کرتا ہے، وہ صالح نہیں، اس میں درد دکھ کا زہر ہے۔'' (دستک)

استحصال اور ظلم کے خلاف نفرت اور ایک تیکھا طنز کہانی کو نہ صرف حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے؛ بلکہ نا مساعد حالات میں بھی زندگی کا حوصلہ نہ کھونے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ کہانی اردو کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

دیہات کی فضا اور دیہی زندگی سے شین کی واقفیت اور انسیت کچھ اس طرح ہے، گویا وہ دل کے راستے ان کی روح میں اتر گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کہانیوں میں ان کی منظر کشی کا مرحلہ آتا ہے تو شین کے قلم سے نقوش کے ایسے نادر نمونے وارد ہوتے ہیں جو اردو افسانوں میں کم یاب ہیں۔ بارش کی آس میں ترستی نگاہیں، امید کی ٹوٹتی ڈور اور برے وقت کے اندیشوں کے درمیان وجود آئی ایک کہانی ''آخری سال'' کو پڑھیں تو آپ شین کے فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اساڑھ گذرا تو ساون آیا، وہ بھی گذر گیا۔ آندھیاں آئیں، طوفان آئے، پتھر برسے؛ لیکن پانی نہیں برسا۔ کس کس جتن سے کسانوں نے دھان، بھدوئی اور مڑوا کے بیج بوئے۔ کنویں کے پانی اور جسم کے پسینے سے اس کی سینچائی کی؛ لیکن بیج ٹھیک سے لگ نہ سکے، جو اگ گئے، وہ پنپ نہ سکے، جو پنپ گئے، وہ انچ نہ سکے اور جو انچ گئے، وہ جل گئے۔ انہیں دھوپ کھا گئی، یا لو جھلس گئی۔ بعض کسانوں نے بڑے بڑے جتن سے کہیں کہیں بیج کے پودوں کو بچا رکھا تھا اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے اب بھادوں کی جھڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ بے چینی سے گذر رہا تھا، کیوں کہ اگر اتنی دیر سے کاشت ہوئی تو بیج کے پودے کب پھولے پھلیں گے۔ کب ان کے شگوفوں میں دودھ اور دانہ بھرے گا اور کب وہ پک کر تیار ہوں گے۔ بھدئی کی فصل خالی گئی اور اب اگہنی کا انتظار تھا۔ کبھی کبھی آسمان پر

آوارہ ٹکڑے کسی کونے میں جمع ہوتے اور کسانوں کی پیاسی آنکھوں اور کھیتوں کی تپتی چھاتی کو للچا کر گزر جاتے۔ کسانوں کی ایک نظر زمین پر پڑتی تھی تو دوسری آسمان پر اٹھتی تھی۔ کہیں فاقہ کشی اور کہیں نیم فاقہ کشی تھی۔ ذہنوں اور دلوں پر اندیشوں اور وسوسوں کا غلبہ تھا۔ ساہو کاروں نے بڑے آثار دیکھ کر تجوریوں اور بکھاروں پر مہر لگا دی تھی۔'' (آخری سال)

ان کہانیوں میں جزئیات نگاری کی، جو دنیا آباد ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قاری جوں جوں اس کی سیر کرتا ہے، اس پر کسانوں کی جفاکشی، مفلسی، بے بسی، مظلومی اور بے حسی کی تمام صداقتیں وا ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ خود کو اسی صف میں کھڑا ہوا محسوس کرتا ہے، یہی فنکار کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور یقیناً شین اس میں بے حد کامیاب ہیں۔

تقسیم ہند اور اس کے خوں آشام پس منظر، آزادی کے خواب اور اس کی ہولناک تعبیریں اس عہد کے تمام افسانہ نگاروں اور فن کاروں کے یہاں کسی نہ کسی طور سے تخلیق کا حصہ بنی ہیں۔ شین نے فسادات کے شرمناک اور کربناک خونی کھیل کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بلکہ اس کو جیا بھی تھا۔ صدیوں سے بلا تفریق مذہب و ملت ہر دکھ سکھ کے ساتھی کیسے راتوں رات پرائے ہو گئے۔ کیسے رشتوں میں دراڑ اور دلوں میں دوریاں راہ پا گئیں۔ پتہ بھی نہیں چلا۔ 'ماجرا جو گذر گیا' اور 'کڑوے گھونٹ' جیسے افسانوں میں شین نے گنگا جمنی تہذیب کے زوال کی جانب گامزن ہونے کا جو مژدہ بیان کیا تھا آج حقیقت کا روپ دھارے سامنے کھڑا ہے۔ ''کڑوے گھونٹ'' کے یہ جملے ان ہی کڑوی حقیقتوں کا بیان ہیں:

''........اور آج پورے ڈیڑھ سال کے بعد میں اپنے گاؤں واپس آیا ہوں.......میں ایک سال تک آگ اور خون کی ندی میں تیرتا رہا ہوں۔ پہلے ملک غلام تھا اب آزاد ہو گیا ہے۔ پہلے گیت اور قہقہوں کا اجارہ انگریز کے پاس تھا۔ اب وہ ٹھیکہ بڑے لوگوں کے ہاتھ آ گیا ہے۔ انہوں نے تمام گیت اور قہقہوں کو اپنے محلوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اب تو ہر طرف موت کے راگ سنائی دیتے ہیں، جب ملک کے اونچے ایوانوں پر آزادی کا پرچم لہرایا گیا تھا۔ اس وقت بھی گیت اور قہقہے ناپید ہو گئے تھے۔ چیخیں اور کراہیں فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔ فرنگی جادو گر نے نہ جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا دانت کاٹی روٹی کھانے والے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔'' (کڑوے گھونٹ)

بڑا فنکار صرف وقت کا ہی نباض نہیں ہوتا، اس کی نگاہیں دور رس بھی ہوتی ہیں۔ معاشرے میں رائج بدعتیں اور رسوم خواہ وہ مذہبی امور اور شریعت کے زمرے میں ہی کیوں نہ آتی ہوں کا بے جا استعمال مسائل ہی پیدا کرتی ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر احکام شریعت کو مسخ کرنا اور دین کے نام پر عورت کی تذلیل مسلم معاشرے میں عام بات رہی ہے۔ کسی نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ ایک دن ان کی یہ روش سنگین قومی مسئلہ بن جائے گی اور آپ کی تمام تر مخالفت کے باوجود آپ کے شرعی امور میں قانون کو دخل دینا پڑے گا۔ شین نے ''حلالہ'' اور ''طلاق طلاق طلاق'' کے عنوان سے معاشرے کو بہت پہلے آئینہ دکھا دیا تھا۔ اگر وقت رہتے ہم نے اپنی اصلاح کر لی ہوتی تو ہمیں 'تین طلاق قانون' کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ دونوں کہانیاں شین مظفر پوری کی دور اندیشی اور دور بینی پر دال ہیں۔ 'طلاق طلاق طلاق' کے آخری حصے پر نگاہ کیجیے اور دیکھئے کہ یہ کس طرح ہماری ناعاقبت اندیشی پر تازیانہ ہیں:

''طلاق کے واقعہ کی گونج دب جانے پر شہناز کا ایک خاص معتمد عارف کے پاس آیا۔ واجبات کی ادائی، نجی اشیا اور زیورات وغیرہ کی حوالگی کا سوال تھا۔ فہرست اس کے ساتھ تھی۔ عارف اس کے لیے آمادہ ہی بیٹھا تھا۔ لگے ہاتھوں عارف نے مقررہ شرعی مدت کے گذارہ کی رقم بھی یک مشت پیشگی ادا کر دینے کی پیش کش کر دی؛ مگر اس سوال پر شہناز کے معتمد نے ایک ضد رکھ دیا۔ کہنے لگا۔ ''قانون میں عدت کی مدت مطلقہ کی دوسری شادی کرنے تک تصور کی گئی ہے۔''

عارف جل اٹھا ''اور اگر مطلقہ کو بیوی بنانا کوئی پسند نہ کرے تو؟ اگر مطلقہ ہی دوسری شادی کے جھمیلے میں پڑنے کے بجائے یاری آشنائی کی زندگی پر اکتفا کر جائے تو؟''

یہ اس کا ذاتی معاملہ ہوگا۔ قانونی تحفظ ہر حال اپنی جگہ پر ہے۔'' معتمد نے عارف کے تیکھے اشارے سے ذرا بدمزہ ہو کر کہا۔

''لیکن شریعت تو صرف تین مہینے کے گزارے کا پابند کرتی ہے۔۔۔۔۔ یہی ہوتا آیا ہے۔''

''اب نہیں چلے گا۔ شرط یہ کہ مطلقہ شریعت کی بجائے قانون سے رجوع کرے۔''

عارف احتجاجاً اُبل پڑا۔ ''کسی فاحشہ سے نجات حاصل کرنے کی اتنی سنگین سزا۔ یہ جبر ہے، بے رحمی ہے۔''

''عدالت کا دروازہ بند نہیں ہے۔ وہیں ملاقات ہوگی۔''

وہ شخص چیلنج کے موڈ میں چل دیا اور عارف سوچتا رہ گیا۔

''ایک مظلوم کے زخم پر قانون کا نمک ! یہ شہناز عورت نہیں ایک خطرناک علامت ہے۔ ایک فتنہ، ایک المیہ!'' (طلاق طلاق طلاق)

عورت کو مختلف جہات سے شین نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ بیوی، بہن، معشوقہ سے لے کر بازار حسن کی رونق تک؛ مگر شین کی انفرادیت یہ ہے کہ عورت ان کی کہانیوں میں زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ نظر آتی ہے۔ وہ افسانوی کینوس پر ایک رشتہ بنا دیتے ہیں اور پھر زندگی سے ان کے نبرد آزما ہونے کی کشمکش کو تخلیق کا پیراہن عطا کرتے ہیں۔ اس جانب پروفیسر عبدالمغنی نے نہایت عمدہ اشارہ کیا ہے:

''سماج کے دو بنیادی رکن مرد اور عورت کے درمیان تعلقات اور معاملات کی درستگی کا اسلوب جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام نشیب و فراز کو سمجھ لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ محرکات جنسی، یا معاشی جس نوعیت کے بھی ہوں۔ معاملات کا انسانی، تہذیبی اور اخلاقی پہلو سامنے آئے۔ اس طرح معلوم ہو کہ دو انسان، نہ کہ دو حیوان، انتہائی قریب آ کر ایک دوسرے کو برتتے ہیں، چناں چہ انسانی عمل اور ردعمل کی یہی وہ دلچسپ اور بصیرت خیز داستان ہے، جو شین نے اپنی کہانیوں میں ہمیں سنائی ہے۔'' (جادۂ اعتدال)

''نہ جینے دو گے نہ مرنے دو گے''، ''نشی ڈارلنگ''، ''قانون کی جستجو''، ''آدھی عورت''، ''سرخاب کا پر''، ''طلاق طلاق طلاق''، ''ماجرا جو گزر گیا''، ''سرد جنگ''، ''کسی سے کہنا نہیں''، ''دل کا چور''، ''عورت کا تیسرا جنم''، ''نئی الف لیلہ''، ''ایک خواہش اور''، ''اچھی بیٹی برا آدمی''، ''اور دوسری کئی کہانیوں میں عورت کے نہ جانے کتنے روپ بکھرے پڑے ہیں؛ مگر یہ عورتیں بنیادی طور پر شین کے یہاں محبت کی علامت ہیں اور ایک مثبت رویے کے ساتھ اپنی نمائندگی درج کراتی ہیں۔

''دل کا چور'' کا یہ اقتباس عورت کے تئیں شین کے بنیادی نقطہ نظر کی حمایت کرتا ہے:

''یہ........عورت نہیں آب حیات ہے۔ مایوس اور مضمحل زندگی کے لیے امید کا روشن چراغ...........دراصل یہ.........کی بچی دل میں صرف ایک خواہش لے کر پیدا ہوئی ہے۔ محبت محبت......اور جب وہ چیز اسے مل گئی تو وہ ہر شوق، ہر تمنا سے بے

نیاز ہوگئی.........نہ اس کو کچھ چاہیے، نہ وہ اپنی زندگی میں کمی چاہتی ہے۔‘‘

سماجی ناہمواریوں کی ایک لمبی فہرست ہے جس پر شین نے نہ صرف خامہ فرسائی کی ہے؛ بلکہ کاری ضرب بھی لگائی ہے۔اس سلسلے کی دو اہم کہانیوں کا ذکر ضروری تصور کرتا ہوں۔ ’’کسی سے کہنا نہیں‘‘ اور ’’عذاب‘‘۔ ’کسی سے کہنا نہیں‘ میں ذات پات کی لعنت بعض اوقات ایسی صورت حال سے دوچار کر دیتی ہے، جب آپ کا سب کچھ آپ کی دسترس سے باہر چلا جاتا ہے؛ مگر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے آپ کسی کے جذبات کا سودا کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔اس کہانی میں سفر کے دوران ایک اسٹیمر پر ایک ہی علاقے کی رہنے والی دو عورتیں جن میں ایک برہمن اور دوسری دوسادھن ہے، اپنے اپنے بچوں کے ساتھ لیٹی ہیں۔نیند کی حالت اور رات کے اندھیرے میں غلطی سے برہمن عورت کا بچہ دوسادھن عورت کا دودھ پی لیتا ہے۔ برہمن جوڑے کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ اس ’’سانحے‘‘ پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسادھن کو چند روپئے کے نوٹ تھماتے ہوئے کہتے ہیں۔ ’کسی سے کہنا نہیں‘۔ دوسادھن غریب ہے؛ مگر یہاں اسے اپنی ممتا اور جذبات دونوں کی توہین ہوتا محسوس ہوتا ہے، لہٰذا وہ ان کے دیئے نوٹوں کو پھاڑ کر دریا برد کر دیتی ہے۔شین دراصل یہاں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ممتا اور دودھ کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ اس کی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔

’’عذاب‘‘ میں ہڈی سے ہڈی ملانے والے اور اپنی ذات میں ہی بیٹی بیاہنے کی ضد میں لڑکیوں کی شادی کی عمر نکل جانے، یا ان کے غلط اقدام اٹھا لینے کی کہانی پیش کی گئی ہے۔اسلام میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں ہے؛ مگر ہندوستانی معاشرے کی یہ لعنت مسلم گھرانوں میں اس طرح گھر کر چکی ہے کہ داروغہ نوشیرواں خاں جیسے کتنے خاندانی لوگ اپنی عزت و آبرو کو بے گھر کر چکے ہیں۔اپنی اکلوتی بیٹی کے ہر رشتے کو نوشیرواں اس لیے ٹھکراتے رہے کہ لڑکا خاندانی اور حسب نسب کے اعتبار سے ان کی ذات کا نہ تھا۔ بالآخر خاندانی لڑکے کی غیر موجودگی میں خاندانی نوکر نے بازی مار لی اور داروغہ کی بیٹی کے پاؤں بھاری ہو گئے۔کسی طور سے جب یہ خبر داروغہ صاحب کے کانوں میں پڑی تو ان کی روح پرواز کر گئی۔افسانے کا آخری منظر کچھ یوں ہے:

> ’’ہوا یہ کہ اذان کی آواز سنتے ہی خاں صاحب بستر سے اٹھ گئے تھے، باہر جاتے جاتے وہ نازی کے کمرے کی چوکھٹ پر رک گئے تھے؛ کیوں کہ اندر سے ماں بیٹی کی سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، پھر وہ چکرا کر اپنے بستر پر آ گرے تھے، قلب اپنا توازن کھو چکی تھی۔

> بیگم روہانسی آواز میں چیخیں ’’ارے دوڑو! غضب ہو گیا! ڈاکٹر کو بلاؤ!‘‘
> ایک طرف سے رحیمہ بوا اور دوسری طرف سے نازی دوڑی۔
> ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔گھبراہٹ اور پریشانی کے چند منٹ بعد ہی بیگم صاحبہ کی جگر خراش چیخ سے ساری حویلی کانپ اٹھی۔ داروغہ نوشیرواں پر عذاب کا آخری لمحہ بھی گذر چکا تھا۔‘‘ (عذاب)

مجرم ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتے؛ بلکہ حالات اور ماحول اسے جنم دیتے ہیں۔شین مظفر پوری اس نظریے کے حامل ادیبوں میں سے تھے۔ ’’قانون کی بستی‘‘ اور ’’کیا جینا کیا مرنا‘‘ اس پس منظر میں لکھی گئی یادگار اور بہترین کہانیاں ہیں۔کسی بھی انسان کے اندر خیر و شر، دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں۔عادی مجرم کے اندر بھی کہیں نہ کہیں انسانیت پوشیدہ رہتی ہے۔ ’’قانون کی بستی‘‘ میں مرکزی کردار ڈاکو شیر سنگھ کا خوف علاقے کے لوگوں میں اس قدر طاری ہے کہ اس کا نام آتے ہی اوسان خطا ہو جاتے ہیں؛ مگر ایک شہ زور عورت جسے وہ اٹھا لے جاتا ہے اور اپنی بیوی بنا لیتا ہے، رفتہ رفتہ اس پر اس طرح حاوی ہو جاتی ہے کہ اس کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔اپنے ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود وہ ازدواجی زندگی کے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔اپنے بچے کے روشن مستقبل اور جرم کی دنیا سے دور رکھنے کی خواہش نے اسے ’قانون کی بستی‘ میں آنے کو مجبور کر دیا ہے؛ مگر یہاں آ کر اسے بے انتہا حیرت ہوتی ہے کہ ’قانون کی بستی‘ میں جو لاقانونیت ہے، وہ شرمناک ہی نہیں؛ بلکہ ناقابل معافی ہیں۔اس ماحول میں ہر لمحہ اسے گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور وہ اکثر اپنی بیوی چمپا سے طنز آمیز لہجے میں پوچھتا ہے:

> ’’تمہارا قانون کیا ہے؟ تمہارا سماج کہاں ہے؟ شیر سنگھ کے سر کی قیمت دس ہزار مقرر کرنے والے سورما کہاں ہیں؟ شہر کے لاکھوں ڈاکوؤں کو لائسنس دیئے مگر جنگل کے ایک شیر سنگھ کے پیچھے پڑنے والے کہاں ہیں؟ (قانون کی بستی)

ان سب کے باوجود شیر سنگھ اچھا انسان اور ذمہ دار شہری بن کر رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے؛ مگر نام نہاد مہذب معاشرہ پہلے اس سے اس کا تین سالہ بچہ اور پھر اس کی حاملہ بیوی کو چھین لیتا ہے۔ شیر سنگھ اسے برداشت نہیں کر پاتا۔اس کے اندر کا شیر ایک بار پھر بیدار ہو جاتا ہے، جسے تھپکیاں دے دے کر اس نے سُلا دیا تھا۔ بیوی کی موت کے ذمہ دار ڈاکٹر کے سینے میں گولیاں اتارنے کے ساتھ وہ

پھر اپنی پچھلی زندگی میں واپس لوٹ جاتا ہے۔ کہانی کے آخری سطور میں افسانہ نگار نے 'قانون کی بستی' کا اصل چہرہ یوں بے نقاب کر دیا ہے:

''ابھی شیر سنگھ کا سب منھ ہی تک رہے تھے کہ اچانک پستول کی تابڑ توڑ دو گولیاں ڈاکٹر کے سینے کے پار ہو گئیں۔ اور بھگدڑ اور ہلچل کے ماحول میں شیر سنگھ بھاگ نکلا۔

تیسرے دن شیر سنگھ اپنی لاقانون دنیا کی سرحد پر کھڑا قانون کی بستی کو ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ گھور رہا تھا۔ جیسے زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو کہ قانون کی بستی کے قاتلوں کو ان کی دنیا مبارک۔ پھر اس نے ایک لمبی گہری سانس لے کر ہنھ کر کے گویا یہ کہا ''اچھا پھر ملیں گے، جب قانون بنانے والے قانون پر چلنا بھی سیکھ جائیں گے۔'' اور قانون کی بستی پر نفرت کی ایک نگاہ ڈال کر شیر سنگھ جنگل کی طرف مڑا اور چل پڑا۔''

یہ المیہ ہے کہ ہم نے ایسا مہذب اور تعلیم یافتہ معاشرہ تعمیر کیا ہے، جہاں بھٹکے ہوئے لوگ اپنی اصلاح کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ قدم قدم پر لاقانونیت کا دور دورہ ہے اور ہم بے بس اس سماج میں زندہ رہنے کو مجبور ہیں۔ شین اس مسئلے پر ہمیں سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

'کیا جینا کیا مرنا' کا سرجو استاد بھی عادی مجرم ہے؛ مگر ایک واقعے نے اس کے مردہ ہو چکے ضمیر کو یوں زندہ کر دیا کہ اس نے اپنی مجرمانہ اور ناپاک زندگی مزید جینا گوارہ نہیں کیا اور ابدی نیند سو گیا۔ شین کی یہ کہانی ہمارے پورے سسٹم، جس میں ہماری عدلیہ بھی شامل ہے پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ صحیح فیصلے سے محرومی کس طرح ایک اچھے انسان کو ارتکاب جرم کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور قانون سے خود کو اوپر تصور کرنے والا قاتل کس طور سے خود احتسابی کے بعد اپنی زندگی سے متنفر ہو جاتا ہے، جیسی متضاد سچویشن کو اس سلیقے اور قرینے سے تخلیق کا جامہ پہنایا ہے کہ شین کے فنی دسترس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ کہانی کا یہ اقتباس پورے منظر نامے کو عیاں کر دیتا ہے:

''لڑکی نے پلٹ کر سرجو استاد کے چہرے پر تھوک دیا اور گوتم کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

سرجو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔ اس کو قانون پر غصہ آ رہا تھا، جس نے خواہ مخواہ شک کا فائدہ دے کر اس کو زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا تھا، ورنہ آج اس کی یہ توہین کیوں ہوتی۔ اب وہ زندہ رہنے کی اذیت میں مبتلا رہنا نہیں چاہتا تھا؛ مگر اب وہ

زندہ ہی کہاں تھا۔ مردہ زندگی جینے سے مرجانا اچھا تھا اور اس دن کے بعد سرجو استاد کسی کو نہیں دِکھا۔''

شین مظفر پوری کا تخلیقی سفر کبھی کسی نظریہ، یا ازم کے زیر اثر پروان نہیں چڑھا؛ مگر یہ حقیقت ہے کہ شین کا عہد ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہے اور شین ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہنے کے باوجود اس سے متاثر ضرور ہوئے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسندیت کے عناصر جا بجا موجود ہیں۔ شین نے ایک انٹرویو میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

''ابتدا سے لے کر اب تک ادب وصحافت میں میرا کوئی راہبر اور استاد نہیں رہا ہے۔ میری حیثیت خود رو پودے کی ہے۔ اپنی کسی صلاحیت کو ہی میں نے استعمال کیا ہے۔ تجربے میں نے ضرور کئے ہیں؛ مگر شعوری طور پر نہیں، چوں کہ میرا تعلق ہمیشہ اردو افسانے سے رہا ہے؛ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ میری تحریروں میں تجربے ہوتے رہے ہیں۔ میرا ایک افسانوی مجموعہ آیا تھا، یہ درمیانی عہد مجموعہ ہے، اس میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۴ء تک کے افسانے ہیں۔ ایک افسانہ ''چہرے کی تلاش'' ۱۹۷۵ء کا بھی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آ جائے گی کہ میرے فکر وفن میں کس طرح کی تبدیلیاں آئی ہیں۔''

(شین مظفر پوری سے ایک مصاحبہ۔ مناظر عاشق ہرگانوی)

اس انٹرویو میں جس افسانہ (چہرے کی تلاش) کا ذکر شین مظفر پوری نے کیا ہے کے تعلق سے یہ بات عام ہے کہ موصوف کا یہ افسانہ جدیدیت کے زیر اثر لکھا گیا ہے؛ مگر اس افسانے کی وجہ تخلیق بیان کرتے ہوئے افسانہ نگار نے راقم الحروف سے کہا تھا کہ ''جدیدیت کے عروج کے بعد بعض جدید افسانہ نگاروں نے میرے سلسلے میں یہ کہا کہ 'جدید افسانے' لکھنا میرے بوتے سے باہر کی چیز ہے، سو میں نے ''چہرے کی تلاش'' لکھ کر ان کی غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔'' ظاہر ہے جدیدیت شین کے نزدیک کوئی پسندیدہ چیز نہیں تھی؛ مگر اسے افسانے میں برت کر شین نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا۔ گو کہ یہ تجربہ ان کا پہلا اور آخری تجربہ تھا؛ لیکن عصر حاضر میں انسان کی بے چہرگی کا جو منظر نامہ شین نے پیش کیا ہے وہ قابل دید ہے۔ افسانے میں چراغ، چہرہ اور سایہ کو بطور علامت استعمال کر کے افسانہ نگار نے انسانی وجود کے ارتقا کی کہانی پیش کی ہے۔ ابتدا میں انسان کے چہرے پر جو نور تھا وہ وقت کے

ساتھ انسان کے اندر پنپتی بداعمالیوں کے عوض ماند پڑنے لگا اور ایک وقت وہ آیا، جب ترقی کی رفتار نے اس سے اس کا چہرہ ہی چھین لیا اور تب سے آج تک انسان ہاتھوں میں چراغ لیے خود اپنے چہرے کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ درج ذیل اقتباس کہانی کی تکنیک، زبان اور پیش کش پر شین کی فنی گرفت کا پتا دیتا ہے:

''میں آدمی ہوں.........کائنات کا پہلا آدمی، جس کا پیکر کھنڈر بن چکا ہے اور جو نئے پیکروں میں، لاکھوں صدیوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے؛ مگر....... چہرہ کہاں ہے؟ وہ چہرے جو میں شفاف پانی اور شفاف آنکھوں کے آئینے میں دیکھتا آیا کیا ہوا؟ کہاں گیا؟ میں تو اپنے آپ کو نہایت آراستہ و پیراستہ اور سجل، گوشت پوست کا ایک بے چہرہ وجود پا رہا ہوں۔ میرا چہرہ کیا ہوا؟ میں اپنے آپ کو کیسے پہچانوں؟ میرا جسم اتنا دلکش اور حسین بن گیا، اس پر اتنی اچھی پوشاک چڑھ گئی؛ مگر اس آرائش و زیبائش کے ساتھ اس خوبصورت دھرتی پر میں بے چہرہ گھوم رہا ہوں۔ ہر سمت نظر دوڑاتا ہوں؛ مگر مجھے اپنا چہرہ نہیں مل رہا ہے، جو میں پہلی بار چراغ کی روشنی میں اپنے ہمزاد کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔''

(''چہرے کی تلاش''، ''زبان و ادب''، جنوری ۱۹۷۶ء)

پلاٹ کی تشکیل کے فن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تعمیر کے فن کے مترادف ہے، جس طرح معمار عمارت کو خوبصورت اور مضبوط بنانے کے لیے اس کی ایک ایک اینٹ کو سلیقے اور ہنرمندی سے جوڑتا ہے۔ ٹھیک یہی کام افسانہ نگار، یا ناول نگار واقعات کے مختلف اجزا کو خوبصورتی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کرتا ہے۔ یہ شیرازہ بندی جس قدر احتیاط اور فطری انداز میں انجام پاتا ہے پلاٹ اتنا ہی گٹھا ہوا اور مربوط ہوتا ہے۔ کامیاب پلاٹ کی سب سے اہم خوبی تجسس اور تحیر کا ہونا ہے۔ قاری کے ذہن میں بار بار یہ سوال سر اٹھائے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ شین کے افسانوں میں پلاٹ سازی کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''شین کے افسانوں میں پلاٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس پلاٹ کی تعمیر وہ ایک معمار کی طرح کرتے ہیں۔ واقعات کی ترتیب اور ان کا ارتقا کے خاصا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا مکمل دائرہ بنا دیتے ہیں، جس کی لکیروں کا چھوٹا سے چھوٹا حصہ بھی ادھر ادھر نہیں

نکلتا، نہ ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہے۔ ایک تراشا ہوا بالکل سڈول ہیولیٰ ابھرتا ہے۔ ماجرا کی تمام جزئیات اس درجہ باہم پیوستہ ہوتی اور سامنے آتی ہیں، جسے انٹی کے لپیٹ کی طرح یکے بعد دیگرے نکلتی چلی جارہی ہوں؛ بلکہ واقعات کا تسلسل کچھ ایسا ہوتا ہے، جیسے ایک واقعہ دوسرے کے اندر سے نکل رہا ہو؛ لیکن ارتقائے ماجرا میں اس ربط اور روانی کے باوجود یکسانی کی اکتاہٹ نہیں پیدا ہوتی۔ افسانہ نگار قاری کو پیہم نئے، غیر متوقع حوادث سے اتنی چابکدستی کے ساتھ دوچار کرتا ہے کہ نہ صرف دلچسپی قائم رہتی ہے؛ بلکہ تجسس پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات یہ تجسس شدید ہو کر سنسنی میں تبدیل ہو جاتا ہے''۔ (''جادۂ اعتدال'')

یہ حقیقت ہے کہ شین کو پلاٹ سازی کے فن پر قدرت حاصل ہے۔ واقعات کی ترتیب میں ربط و تسلسل اور تناسب و توازن کا جو فطری انداز شین کے یہاں موجود ہے، وہ واقعات سے ان کے براہ راست لگاؤ، گہرے مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بدولت ہے۔ صداقت کا یہ عنصر پلاٹ کو ایک فطری بہاؤ عطا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ قصے جو عام فنکار کے ہاتھوں سپاٹ پلاٹ کو جنم دیتے ہیں، شین کے یہاں واقعات، رنگا رنگی کے باوجود ایک مربوط پلاٹ کی شکل میں ارتقا پذیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ ''سرکس کا شیر'' اور ''تین لڑکیاں ایک کہانی'' کا مطالعہ اس کا بین ثبوت ہیں۔ شین کی وہ کہانیاں جہاں مقصدیت کے غالب ہونے کا خطرہ پلاٹ کے توازن کو لاحق تھا، مصنف کمال ہنرمندی کے ساتھ دامن کشاں گزر گئے ہیں۔ ''چراغ تلے اندھیرا'' اور ''قانون کی بستی'' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔

شین مظفر پوری کے افسانوں کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر وا ہوتی ہے کہ ان کہانیوں کا پلاٹ سادہ؛ مگر دلچسپ ہوتا ہے۔ معمولی قصوں میں بھی سپاٹ پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ تجسس کا عنصر ہر لمحے قاری کو باندھے رکھتا ہے اور کہانی کے اختتام تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ شین اپنے افسانوں کے پلاٹ کو یوں تراشتے، سنوارتے اور نکھارتے ہیں جیسے کوئی دلہن سجائی جاتی ہے۔

پلاٹ سازی کے تعلق سے شین مظفر پوری کی غیر معمولی دلچسپی کا منفی پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے باب میں ان کے افسانے گہرے نقوش مرتب کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔ افسانوں میں یوں بھی کردار نگاری پر زیادہ قوت صرف کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ افسانہ نگار ایک محدود دائرے میں ہی کرداروں کو ابھارتا اور نمایاں کرتا ہے، اس کے باوجود بڑے افسانہ نگاروں نے فکشن میں یادگار اور جان دار کردار خلق کئے ہیں، شین کے یہاں یہ کمی کھٹکتی ہے۔ ان

کے افسانوں کا مطالعہ پروفیسر عبدالمغنی کے اس خیال کا ہمنوا بنا دیتا ہے کہ:

''شین مکالمے اور کردار نگاری پر زور نہیں دیتے، پوری توجہ قصے کے بیان پر صرف کرتے ہیں۔ کہانی بننے کے لیے وہ کرداروں کی گفتگو اور ان کی نقل و حرکت کو قطعی غیر اہم؛ بلکہ شاید مزاحم سمجھتے ہیں......اوّل تو ان کے افسانوں میں کوئی ایک کردار اس غالب حد تک نمایاں ہوتا ہی نہیں کہ کہانی کے چوکھٹے سے باہر نکل کر اپنے طور پر زندہ رہ سکے اور جو کردار اس چوکھٹے کے اندر بھی نمایاں ہوتا ہے، اس کی ہستی مستقل نہیں ہوتی۔'' (''جادۂ اعتدال'')

پروفیسر عبدالمغنی کے اس قول سے جزوی طور پر اتفاق کرتے ہوئے میرا خیال ہے کہ شین مظفر پوری کے افسانوں میں ایسے کئی کردار موجود ہیں، جو قاری پر اپنا نقش چھوڑنے میں نہ صرف کامیاب ہیں؛ بلکہ اردو کے یادگار کرداروں میں ان کا شمار کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر 'قانون کی بستی' کا مرکزی کردار شیر سنگھ کے اندر وہ ساری خوبیاں اور Potentiality موجود ہے، جو اسے ایک زندہ جاوید کردار بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس ذیل میں ''نازک بات'' کا کردار رمضانی اور ''بد صورت'' کی کردار زبیدہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ شین کے کرداروں میں وہ کردار زیادہ موثر اور فعال ہیں، جن کا تعلق نچلے، یا نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شین نے ان لوگوں کے ساتھ نہ صرف شب و روز گزارے ہیں؛ بلکہ ان کے جذبات و احساسات کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ شین کے یہاں بعض نسوانی کردار بھی یادگار کردار کا درجہ پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان میں ''بدصورت'' کی زبیدہ کے کردار کا ذکر بطور خاص کیا جا سکتا ہے۔ اس کردار کا فطری ارتقا اور حالات کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اسے ایک منفرد کردار بناتا ہے۔ بد صورت ہونے کے باوجود اس کی زندگی میں جو عزم، حوصلہ اور اس کی ذات میں جو خودداری ہے، وہ اسے حسن عطا کرتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر اسی داخلی حسن کی بدولت وہ ایک نابینا میوزک ٹیچر سے شادی کرنے کا فیصلہ کر کے سب کو چونکا دیتی ہے۔ شین کے دوسرے یادگار نسوانی کرداروں میں ''ریت کا محل'' کی پارو اور ''قانون کی بستی'' کی چمپا کا ذکر بھی ناگزیر ہوگا؛ کیوں کہ یہ دونوں کردار جاندار اور Bold ہونے کے ساتھ ساتھ لازوال محبت کا نمونہ بھی پیش کرتے ہیں۔

قبل یہ ذکر آ چکا ہے کہ شین مظفر پوری کردار نگاری کو پلاٹ پر فوقیت نہیں دیتے۔ ان کے کردار اپنے انفرادی اوصاف و افعال کو ماجرا نگاری کی نذر کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شین کے

یہاں کردار نگاری میں مکالمہ کی وہ صورت نظر نہیں آتی، جس سے کرداروں کے فطری اور حقیقی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اکثر شین کے کردار اپنی فضا، اپنے ماحول اور اپنے طبقات کی زبان نہیں بولتے؛ بلکہ شین کی زبان بولتے نظر آتے ہیں؛ مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شین نے اپنے افسانوں میں علاقائی زبان اور محاوروں کا کثرت سے اور عمدہ استعمال کیا ہے۔ شین کا یہ فنی کمال ہے ان کی کردار نگاری میں مکالمے ایسی شان عطا کر دیتے ہیں کہ وہ بالکل فطری اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

شین کے افسانوں کا نقطۂ عروج اکثر ڈرامائی اور چونکانے والا ہوتا ہے۔ اس فن میں شین کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ اردو افسانہ نگاری کے باب میں ان کا کوئی مقابل نظر نہیں آتا۔ منتہا کا یہ انداز شین کے افسانوں میں غیر فطری نہیں معلوم ہوتا؛ بلکہ قصّے کی ترتیب سے اس قدر ہم آہنگ اور مربوط ہوتا ہے کہ قاری کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ سفر میں کب موڑ آ گیا اور کہانی کیسے ایک نئی راہ پر آگے نکل گئی، ''لڑکی جوان ہوگئی''، ''تیسرا تجربہ''، ''اسلوب'' اور ''ایک عورت ہزار دولہا'' جیسی کہانیوں کو پڑھیے تو آپ پائیں گے کہ شین کی یہ تکنیک نہ صرف قصے کے لطف کو بڑھا دیتی ہے؛ بلکہ اس میں تہہ داری اور معنویت کی ایک نئی دنیا بھی آباد کر دیتی ہے۔

شین مظفر پوری کا اسلوب دراصل ان کے افسانوں کی جان بھی ہے اور اس سے ان کی پہچان بھی متعین ہوتی ہے۔ ان کے اسلوب کی دلکشی کا راز اس کی سادگی اور رعنائی ہے۔ سبک اور رواں الفاظ کو یوں نظم کرتے ہیں کہ اس کے اندر شیرینی اور تہہ داری دونوں پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان ایک خاص آہنگ اور لے کے سہارے جادو جگاتی ہے۔ اسلوب کا یہ نرالا انداز جس میں بے شمار رنگ شامل ہیں۔ شین کے افسانوی کینوس پر الگ الگ نہ جانے کتنے نقش اکیرتے ہیں اور ہر نقش بہترین نثر کا عمدہ نمونہ۔ شین کا یہ اسلوب کچھ تو فطرت نے انہیں ودیعت کیا ہے اور کچھ افسانہ نگار نے اپنا خون جگر اس میں ملایا ہے۔ اس امتزاج سے جو اسلوب معرض وجود میں آیا ہے، اس کی سحر کاری سے بچ پانا ممکن نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر شین کا لہجہ تلخ و تند بھی ہو جاتا ہے، طنز کے تیر جگر کو چھلنی کرتے ہیں تو مزاح اس پر مرہم بھی لگاتا ہے۔ طنز و مزاح کا یہ توازن شین کے اسلوب میں ایک ایسا وقار پیدا کر دیتا ہے، جو لوگوں کے احساسات و جذبات کو مہمیز کرتا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''میں قصے کہانیاں اس لیے پڑھتا ہوں کہ ان میں لطف محسوس کرتا ہوں، کچھ

کھوتا ہوں، کچھ پاتا ہوں اور افسانے میں کسی کو بنتے بگڑتے دیکھ کر خود بھی بنتا بگڑتا ہوں۔ اچھے افسانے سے میرا علم کچھ بڑھ جاتا ہے، تجربہ کچھ گہرا ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی فطرت، ان کے اتار چڑھاؤ کچھ سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ افسانہ وہ فریب ہے، جو حقیقت کو کچھ اور روشن کر دیتا ہے۔ وہ جھوٹ ہے، جو سچ کی مدد کے بغیر خوبصورت معلوم نہیں ہوتا۔'' (''تنقیدی اشارے'')

بلاشبہ شین مظفر پوری کے افسانے سرور وانبساط اور لطف کے وہ خزینے ہیں، جن کے ذریعہ قاری مسرت سے بصیرت تک کا فکر انگیز سفر پلک جھپکائے بغیر طے کر لیتا ہے۔

❋

ناول نگاری

شین مظفر پوری کے ادبی سرمایے میں تین ناول اور دو ناولٹ شامل ہیں۔ ناول ''ہزار راتیں'' (۱۹۵۵ء)، ''چاند کا داغ'' (۱۹۵۶ء) اور ''کھوٹا سکہ'' (۱۹۶۱ء) کے علاوہ ''فرحت'' (۱۹۴۹ء) اور ''تین لڑکیاں ایک کہانی'' (۱۹۵۹ء) ان کے ناولٹ ہیں۔ ''فرحت'' جو کراچی سے شائع ہوا تھا، اس کی کاپی ہندوستان میں نایاب ہے، یہاں تک کہ شین کے وارثین کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، البتہ ان نے ایک ناول ''گرم راکھ'' کے عنوان سے لکھا تھا، جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

شین کے ناولوں اور ناولٹ کے مطالعہ کے بعد جو بات فوری طور سے ہمارے ذہن میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ شین کے اندر افسانے کو ناول بنا دینے کی فطری صلاحیت موجود تھی؛ یعنی احساس وجذبات، تخیل اور ادراک کی جولانی کا جوہر جو افسانوی سطح پر ایک محدود دائرے میں نظر آتا ہے، ناولوں میں وسیع وبیکراں تناظر اختیار کر گیا ہے۔ ارتقا کے اس پورے پروسیس کو شین جس بنیادی اوزار (Tools) کے سہارے انجام دیتے ہیں وہ ان کا تراشیدہ وتابندہ اسلوب ہے۔ انسانی حیات میں جنس اور معاش کی کشمکش اور اس کے پیش نظر معاشرے میں ہر روز اخلاق واقدار کی بنتی بگڑتی تصویر ان ناولوں میں کچھ یوں رونما ہوئی ہے کہ قاری تمام تر ہمدردانہ رویے کے ساتھ کب ناول کا حصہ بن جاتا ہے اسے خود معلوم نہیں ہوتا۔

وارث علوی نے اپنے ایک مضمون ''بو۔۔۔۔۔۔ اور بوئے آدم زاد'' میں لکھا ہے:

"ادب کا موضوع انسان کی ذات اور اس کے جذبات کی دنیا رہی ہے۔ ایک آدمی، آدمی کے متعلق، فطرت، کائنات اور خدا کے متعلق کیا سوچتا اور محسوس کرتا رہا ہے اور اپنے گرد و پیش سے اس کے جذباتی رشتے کی نوعیت کیا رہی ہے۔ یہ ہے آرٹ اور ادب کا موضوع۔"

("شب خون"، شمارہ ۶۳، اگست ۱۹۷۱ء)

شین کے فکشن کی پوری دنیا اس بنیادی نکتے پر استوار ہے۔ اپنے آس پاس کے لوگ، ان کی ذات، ان کے جذبات، ان ناولوں میں جس طرح پیش ہوا ہے، وہ خاصے کی چیز ہے؛ مگر ادب کا یہ موضوع آرٹ کا بہترین نمونہ نہیں بن سکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ بصیرت و آگہی کا فقدان ہے۔ وہ بصیرت و آگہی جو تخلیق کو لازوال اور آفاقی بناتا ہے۔ اس کی جانب پروفیسر عبدالمغنی نے واضح اشارہ کیا ہے:

"شین مظفر پوری کے فن میں اس نقص کا سبب ان کے ذہن کی ایک مجبوری ہے۔ افسانہ نگار کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین نہیں، حیات، کائنات اور انسان کی اصلیت اور ارتباط باہمی کے متعلق کسی نظریے سے وہ بہرہ ور نہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان معاشرتی تعلق کے کسی نظام کا نقشہ ان کے ذہن میں واضح نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فرد اور سماج، زندگی اور انسان، مرد اور عورت کے موضوعات پر شین نے جو تبصرے اور نکتے پیش کئے ہیں، وہ نہایت خیال انگیز ہونے کے باوصف ہماری الجھنوں کو صاف نہیں کرتے اور نہ راہ مستقیم کی طرف کوئی رہنمائی کرتے ہیں۔ بس جہاں تہاں روشنی کی چند لکیریں بجلی کی طرح چمک اٹھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کائنات کی وسیع تاریکی میں راہ چلنے کے لیے یہ جھلملاہٹیں کافی نہیں۔" ("جادۂ اعتدال")

معاملہ یہ ہے کہ شین صاحب سے ویسی آفاقیت کی توقع فضول ہے، جو منٹو، یا اس صف کے چند ایک تخلیق کار کے یہاں موجود ہے۔ ہر فن کار کا ویژن اور قوت مشاہدہ ایک سا نہیں ہوتا۔ خام مواد کو تخلیق کے سانچے سے کب اور کتنی آنچ کے ساتھ گزارنا ہے، ہر کسی کا اپنا ہنر ہوتا ہے۔ شین کے ناولوں میں صورت یہ ہے کہ وہ واقعات سے فوری طور پر متاثر ہوتے ہیں؛ بلکہ اکثر جذباتی ہو جاتے ہیں اور تخلیقی کرب کی آگ سے گزارے بغیر حسّیات و جذبات کے سہارے ایک جاذب منظر نامہ پیش کر دیتے ہیں۔

"ہزار راتیں"، "چاند کا داغ" اور "کھوٹا سکّہ" موضوع کے اعتبار سے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ حیات کی کشمکش، وقت کا جبر اور جینے کی آرزو میں تِل تِل مرنا تینوں ناولوں کے کرداروں کا مقدر ہے؛ بلکہ انجام بھی یکساں نامرادی، ناکامی، محرومی اور بالآخر قید حیات سے آزادی۔ درحقیقت ناول نگار یہاں قصوں کا راوی ہی نہیں ہے؛ بلکہ خود قصہ کا حصہ بن گیا ہے۔ پورے نظام سے وہ اس قدر نالاں اور بدحظ ہے کہ وفور جذبات سے فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ اپنا پورا زور معاشرے کی کج روی سے پردہ اٹھانے پر صرف کر دیتا ہے۔ اس عمل میں وہ فن کار کے منصب سے الگ ہو کر ایک جانب دار کی طرح اپنے کرداروں کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے۔ اس طرح شین اپنے ناولوں کو دلچسپ اور ناانصافی و نابرابری پر مبنی سماج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا ذریعہ بنانے میں تو کامیاب ہو جاتے ہیں؛ مگر اس منفی سچویشن سے نبرد آزما ہونے کا کوئی طریقہ کار ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ قاری اور اپنے کردار دونوں کو ایک خلا میں چھوڑ جاتے ہیں، جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ان کے پاس نہیں ہوتا ہے، بے دست و پائی کی یہی منزل شین کو آفاقیت کی بلندی تک پہنچنے نہیں دیتی ہے اور ان کے ناول تخلیق کا اعلیٰ نمونہ بننے سے رہ گئے ہیں۔

قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ "ہزار راتیں" اور "چاند کا داغ" دونوں میں موضوع اور ماحول کے اعتبار سے کافی یکسانیت ہے؛ مگر فکری و فنی سطح پر دونوں میں ایک واضح فرق بھی ہے اور تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ہزار راتیں فٹ پاتھ پر فقیروں کے درمیان پلی بڑھی ایک لاوارث، بے سہارا اور جاہل لڑکی منّی کی داستانِ حیات ہے، اسے نہ اپنے ماضی کا علم ہے اور نہ مستقبل کا پتا۔ حالات اور وقت کا بہاؤ اسے جس نشیب و فراز سے دوچار کرتا ہے، وہی اس کا مقدر ہے۔ منّی زندگی کے ہر عذاب کو جھیلتی ہے، اس کے اندر face کرنے اور سہنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے؛ مگر حالات سے Assert کرنے اور بادِ مخالف کے رخ موڑ کر فضائے موافق میں تبدیل کر دینے کی طاقت موجود نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا تعلیم سے نابلد ہونا ہے، اس محرومی کے باعث اس کے ذہن و فکر کا سانچہ سکڑا سا رہ گیا ہے۔ اس میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نتیجتاً وہ مواقع ملنے کے باوجود نہ تو اپنی زندگی کو مثبت راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہوتی ہے اور نہ ہی اپنے جیسی دیگر (مثلاً سکینہ) مجبور اور بے بس لڑکیوں کو متاعِ کوچہ و بازار ہونے سے بچا پاتی ہے، البتہ دل ہی دل میں کڑھتی ضرور ہے۔

اس کے برخلاف ''چاند کا داغ'' میں سلطانہ جو ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور مہذب و معزز پس منظر رکھتی ہے، کی ایک لغزش اسے فلمی دنیا تک پہنچا دیتی ہے۔ فلمی دنیا جسے وہ سنہرے خواب کی دنیا تصور کرتی تھی، جسے وہ آرٹ کی دنیا سمجھتی تھی اور جہاں پہنچ کر وہ اپنے آپ کو ثابت کرنا چاہتی تھی، اس کے لیے 'شاک' کی دنیا بن جاتی ہے۔ بظاہر چکا چوند سے پُر فلمی دنیا کی حقیقت جب اس پر آشکار ہوتی ہے اور خود کو وہ تاریک گہری کھائی میں پاتی ہے تو اس کا ذہن و دل ایک شدید نفسیاتی ردِعمل سے دوچار ہوتا ہے، وہ سراپا احتجاج بن جاتی ہے، وہ عہد کر لیتی ہے کہ اس سے جو بھول سرزد ہوئی، سو ہوئی، آئندہ اپنی دانست میں وہ کسی کو اس گندگی کا حصہ نہیں بننے دے گی۔ سلطانہ کے کردار کی یہ خود اعتمادی اور طاقت ظاہر ہے اس کی تعلیم کی بدولت ہے۔ یوں احساس ہوتا ہے گویا ''ہزار راتیں'' کی منّی، ''چاند کا داغ'' میں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو کر سلطانہ بن گئی ہے۔ کردار کا یہ ارتقا شین کے فن کا بھی ارتقا ہے۔ دراصل شین نے ان دو ناولوں میں جنس اور بازارِ حسن کی کہانی نہیں بیان کی ہے؛ بلکہ ہمارے ''مہذب معاشرے'' میں صدیوں سے رائج اس کثافت سے پردہ اٹھایا ہے، جسے گناہ تو سب تصور کرتے ہیں؛ مگر اس گناہ کی لذت سے آشنا ہونے کی تمنا بھی رکھتے ہیں۔

''ہزار راتیں'' اور ''چاند کا داغ'' سے ایک ایک اقتباس آپ کی نذر کر کے میں شین کے اجتماعی شعور اور اخلاقی حِس کی بالیدگی کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ناول نگار کے اندر معاشرے کو اس 'ناسور' سے نجات دلانے کی کیسی تڑپ موجود ہے:

''جمیلہ نے بھی اس کو سمجھایا کہ وہ اس شرمناک زندگی سے باز آ جائے اور کچھ محنت مزدوری کا کام کر کے پیٹ پالے؛ کیوں کہ اس زندگی میں خطرہ بھی تھا اور رسوائی بھی تھی؛ مگر منّی پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، جمیلہ نے صرف دکھ جھیلے تھے، زمانہ نہیں دیکھا تھا؛ اس لیے منّی کو بے وقوف اور سادہ لوح سمجھتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ منّی نے گھریلو اور شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے کیا کیا ہاتھ پاؤں مارے تھے؛ لیکن سماج نے چوں کہ اپنی ایک بے نام اور مستقل ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس کو جنم دیا تھا؛ اس لیے اس کو کبھی اس گندے نالے سے نکلنے کی اجازت نہیں دی اور رفتہ رفتہ وہ اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ گندے نالے سے باہر صاف ستھرے مقام پر اس کا جینا دوبھر ہو جاتا، گندگی اس کی زندگی بن چکی تھی، گندگی کے بغیر سماج بھی زندہ نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ وہ خود گندہ اور

کثیف ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ منّی باہر سے گندی تھی اور سماج اندر سے۔ اندر کی گندگی کو باہر کی گندگی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو سماج کی ساری غلاظت اور کثافت خود اس کے چہرے پہ آ جاتی۔'' (''ہزار راتیں'')

☆

''میں (سلطانہ) تمھیں غارت نہ ہونے دوں گی، خدا نے تمھیں اس لیے حسین نہیں بنایا کہ اپنی مسکراہٹوں کو بیچو اور اداؤں کو نیلام کرو۔ تمھاری آواز کا ترنم اور سوز اس لیے نہیں ہے کہ محفل میں گرمی پیدا کرو۔ عورت چراغِ خانہ بن کر ہی اپنا صحیح مرتبہ پاتی ہے۔ شمعِ انجمن بن کر وہ اصلی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ یہ حسن بہت نعمت ہے۔ اس سے اپنی زندگی کو سجا کر دوسروں کے لیے قابلِ رشک بناؤ۔ عصمت ہی عورت کی خوشبو ہے۔ اس خوشبو کے بغیر دنیا کی حسین ترین عورت بھی کاغذ کے پھول کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایکٹرس اور پارسائی کا کوئی میل نہیں، یا تو عورت ایکٹرس ہو سکتی ہے، یا پارسا۔ بہ یک وقت دونوں نہیں ہو سکتی۔ ایکٹرس کی تنہائی میں اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھو، اس کے احساسات کو ٹٹول کر دیکھو کہ اس کے اندر سیدھی سادی اور پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے کتنی تڑپ ہوتی ہے، اس کی زندگی کی ظاہر داریوں اور رنگ رلیوں پر نہ جاؤ۔ وہ سب اپنے آپ کو اور سوسائٹی کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اداکاری ایک آرٹ ہے اور اس کے آرٹ ہونے میں کوئی شک نہیں؛ مگر اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو عورت طوائف بن سکتی ہے، وہی ایکٹرس بھی بن سکتی ہے۔ طوائف اور ایکٹرس کے درمیان حدِ فاصل برائے نام ہے.........یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں؛ بلکہ میرا تجربہ اور مشاہدہ بول رہا ہے۔'' (''چاند کا داغ'')

شین کے ناولوں کی کردار نگاری Mono Centric ہے؛ یعنی ناول میں ایک ہی کردار اہم ہوتا ہے، جس کے اردگرد قصہ پروان چڑھتا ہے۔ ضمنی کردار اور واقعات فروغ تو پاتے ہیں؛ مگر مرکزی کردار کے معاون کے طور پر۔ کوئی کردار، کوئی واقعہ انفرادی نقش نہیں چھوڑتا، حالانکہ کامیاب ناولوں میں ضمنی واقعات و کردار سے بڑا کام لیا جاتا ہے اور ان کی مدد سے تخلیقی نظام میں ایک دانشورانہ اور فلسفیانہ پیچ دینا آسان ہو جاتا ہے۔ شین کے یہاں یہ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے

کہ شین نے اس واحد کردار کی انفرادی شخصیت کو مخصوص سماجی طبقے کا نمائندہ بنا دیا ہے، مثلاً منّی اور سلطانہ بازارِ حسن تو مسعود صحافت کی دنیا کو Represent کرتے ہیں۔ ان کرداروں پر شین نے بڑی محنت کی ہے اور تینوں کردار کو ایک کامیاب اور یادگار کردار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے؛ مگر شین کی جذباتیت نے انہیں ایک حقیقت پسند ایک واقعیت نگار سے آگے بڑھنے نہیں دیا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی منّی اور سلطانہ کو منٹو کی سوگندھی (ہتک) اور سلطانہ (کالی شلوار) نہ بنا سکے۔

ان سب کے باوجود ''ہزار راتیں'' کی منّی اور جانی، ''چاند کا داغ'' کی سلطانہ اور ریاض اور ''کھوٹا سکّہ'' کا مسعود یادگار اور زندہ کردار ہیں۔ ان کے اندر تازگی بھی ہے اور دلکشی بھی، زندگی جینے کا حوصلہ بھی ہے اور نا مساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بھی ہے۔ آرزوؤں اور امیدوں سے پُر یہ کردار مجاہدانہ تیور رکھتے ہیں؛ مگر وقت کے جبر کے آگے بے بس، اپنی ساری توانائی کھو دیتے ہیں۔ ان کرداروں کا عروج وزوال اور ان کی ناکامی وتباہی قاری کے دلوں میں ایک ایسی ہمدردی اور اپنائیت پیدا کر دیتی ہے، جو بھلائے نہیں بھولتی۔

''کھوٹا سکّہ'' کا مسعود شین کے تمام کرداروں میں زیادہ جاندار اور شاندار کردار ہے۔ اس کردار کی شخصیت الجھنوں اور کش مکش کے درمیان فطری انداز میں کچھ یوں نمو پذیر ہوئی ہے کہ حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ ہم کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر مسعود میں اپنی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ یہ فن کار کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس کردار کی Originality کا راز یہ ہے کہ ''کھوٹا سکّہ'' ایک سوانحی ناول ہے اور مسعود کے کردار میں شین نے خود اپنے آپ کو پیش کیا ہے، چوں کہ یہ کردار ناول نگار کی زندگی سے عبارت ہے، لہٰذا مسعود کے یہاں جو مایوسی اور قنوطیت نظر آتی ہے وہ اصلاً شین پر خود گزری ہے۔ فکشن میں اپنی ذات کی حقیقی مصوری بے حد مشکل امر ہے۔ شین نے اس دشوار عمل کو بخوبی انجام دیا ہے، جو ان کے باکمال ہونے پر دال ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے بارہا یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش مسعود کا کردار حرکت وعمل اور فعالیت کے اس درجے پہ ہوتا، جہاں عمل سے زندگی اور جنت بنتی ہے تو بلا شبہ شین کا یہ ناول صف اوّل میں جگہ پاتا؛ مگر المیہ یہ ہے کہ فنکار خود تمام عمر تہی دست وتہی داماں رہا اور حالات سے سمجھوتا کرنا اس کا مقدر ٹھہرا تو مسعود کے کردار سے عظمت کی امید بے معنی ہے:

''آخر مسعود نے افلاس اور بے کاری سے تنگ آ کر کلکتہ چھوڑنے کا قصد کر لیا، اس کا خیال تھا کہ اس کی مفلسی اور بے روزگاری میں یا تو کلکتہ کا قصور تھا، یا نظام کا۔ اس

کے احساس نے اس کو انقلابی بنا دیا۔ اب اس کو ملازمت وغیرہ کی فکر کم اور ملک میں انقلاب برپا کرنے کی لگن زیادہ رہنے لگی۔ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی بجائے پورے نظام کو بدلنے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس کو سارے زمانے سے شکوہ تھا، پھر اس نے انگریزی اور اردو کے انقلابی لٹریچر کو کھنگالنا شروع کر دیا، طبیعت کے انقلاب پسند اور اذیت کوش بن جانے کے بعد وہ کچھ سخت جاں ہو گیا۔ ایک دو وقت کے فاقے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا؛ بلکہ تین تین وقت کے فاقے کو بھی وہ ہنس کھیل کر برداشت کر لیتا، اب بڑھی ہوئی داڑھی اور میلی پوشاک سے اس کو اپنی کوئی سبکی محسوس نہ ہوتی تھی؛ کیوں کہ اس کو اپنے اِرد گرد ایسے ہی لوگ نظر آتے تھے، یہ سب انقلاب کا پیش خیمہ تھا۔ انقلابی لوگوں کا حلیہ عام طور سے ایسا ہی ہوا کرتا ہے، چاہے وہ سیاست کا پلیٹ فارم ہو، یا شعر و ادب کی انجمن، جن لوگوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، وہاں انقلاب، اذیت کوشی اور سخت جانی کی کہانی کافی مقدار میں ملتی تھی۔ یہ افیون اپنے اندر جادو کا اثر رکھتی تھی۔ فکر وشعور ان کی غنودگی طاری رکھتی کہ احساس کو سنبھالا ہی نہ لینے دیتی تھی۔ اس کو بے عملوں اور خیال پرستوں کے ایسے گروہ نے اپنے اندر ضم کر لیا تھا، جس کا مسلک یہ تھا کہ کچھ نہ کرو اور سب کچھ چاہو۔ سارے زمانے کو کوستے رہو اور جب بھوک ستائے تو انقلاب کے گیت گنگنانا شروع کر دو۔ جان بوجھ کر فاقہ کشی کرو اور اپنے بے جان ہونٹوں اور سوکھے ہوئے چہرے پر جبری مسکراہٹ طاری رکھو۔ سرمایہ داروں کو گالیاں دو اور سرمایہ داری پر گہرے طنز کیا کرو۔ اپنی بدحالی کا سارا الزام دوسروں پر تھوپ دو۔'' (''کھوٹا سکّہ'')

پلاٹ نگاری کے باب میں شین نے انفرادیت قائم کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ پلاٹ کے ارتقا میں تنوع کے ساتھ پیچ وخم صاف نظر آتا ہے۔ واقعات وحادثات اور زندگی کے نشیب وفراز کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ پلاٹ پُر پیچ راہوں پر کبھی تیز، کبھی مدھم رفتار سے ارتقا پذیر ہوتا چلا گیا ہے۔ اسے فطری ارتقا کے بے حد قریب کہا جا سکتا ہے۔ شین کے تمام ناولوں کا اختتام ٹریجڈی پر ہوا ہے۔ ''ہزار راتیں'' کی منّی پاگل پن کے دوروں کے درمیان فٹ پاتھ پر دم توڑ دیتی ہے۔ ایک خارش زدہ کتا کے علاوہ اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا ہے۔ ''چاند کا داغ'' کی سلطانہ کا انجام بھی بے حد دردناک اور عبرت ناک ہوتا ہے۔ کھوٹا سکّہ کا مسعود بظاہر باحیات ہے؛ مگر روز قسطوں میں مرنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں پھیلی ایسی لعنت جس نے نہ جانے کتنے گھر اجاڑے اور نہ جانے کتنی نئی نویلی دلہنوں کو نذرِ آتش کر دیا، نہ جانے کتنی کنواری لڑکیاں ہاتھ پیلے ہونے کے انتظار میں بوڑھی ہو گئیں اور نہ جانے کتنی معصوم جوانی غلط راستوں پر نکل گئیں اور عزت و ناموس بچانے کی خاطر موت کو گلے لگا لیا۔ تلک کی شکل میں یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور روز بروز پھل پھول رہا ہے۔ شین نے اس مسئلے پر نہایت پر اثر اور انسانیت سوز ناولٹ ''تین لڑکیاں ایک کہانی'' تحریر کی ہے۔ حمیدہ، شکیلہ، اور جمیلہ کی کہانی صرف ایک گاؤں گھر کی کہانی نہیں ہے؛ بلکہ، کم و بیش پورا ملک پوری قوم اس عذاب کی زد میں ہے:

> ''ان حرماں نصیب لڑکیوں کی ذلت اور رسوائی کے یہی اسباب تھے۔ ان کی حسرتوں کا خون اسی بیوپار کی گردن پر تھا۔ نہ نو من تیل ہوتا تھا نہ رادھا ناچتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تینوں لڑکیاں اپنے والدین کی سوگوار آنکھوں اور بجھی بجھی آواز کا مطلب سمجھنے لگی تھیں اور ضبط کئے بیٹھی تھیں۔ والدین کی جد و جہد اور سرگردانی جاری تھی؛ مگر سودا کہیں پٹتا ہی نہ تھا اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ ان کے والدین کو ہمدردوں نے مشورے اور دشمنوں نے طعنے دینے شروع کر دیئے۔ کوئی ہمدرد کہتا لڑکی جوان ہو گئی۔ آخر سوچا کیا ہے۔ کوئی بدخواہ طعنے سے کہتا کہ لڑکیوں کی جوانی ڈھل رہی ہے۔ کل کو پوچھے گا کون! ان باتوں سے والدین کا دل کٹ کٹ جاتا اور غیرت سے گردن جھک جاتی۔ مگر وہ کرتے بھی کیا۔ ایک طرف ناک کو صحیح سالم رکھنا تھا اور دوسری طرف جگ ہنسائی کا ڈر تھا۔
>
> جوں جوں دن گزر رہے تھے، سرگرانی بڑھتی جا رہی تھی۔'' (''تین لڑکیاں ایک کہانی'')

ان تمام ناولوں کو جو چیز انفرادیت اور عظمت کے دائرے میں لا کھڑا کرتی ہے، وہ ہے شین کا اسلوب اور ادب اور معاشرے کے تئیں ان کا کمٹمینٹ۔ شین نے جس رواں اور سادہ بیانیہ کا استعمال کیا ہے، وہ شین کا اپنا انداز خاص ہے۔ ایک سدھا ہوا اور باوقار لہجہ شروع سے آخر تک یوں پھیلا دیا گیا ہے، گویا لفظوں کا فشار نہ ہو، گل افشانی کی گئی ہے، البتہ کئی مقامات پر زبان کرداروں کے اپنے نہیں لگتے؛ لیکن کیا کیجیے کہ شین اکثر جذبات سے مغلوب ہو کر خود کرداروں میں اتر جاتے ہیں۔ نتیجتاً ان کے کردار ان کی زبان ہی بولتے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیشتر ناولوں میں (چاند کا داغ کو چھوڑ کر) شین خود راوی ہیں۔ اپنے گرد و پیش، اپنے معاشرے، اپنے

لوگ اور اپنی دنیا کے مسائل سے شین کی دلچسپی، ان کے اندر جو آتش فشاں پیدا کرتی ہے، اس آگ سے ناول نگار نے تخلیق کے خام مواد کو کندن بنانے کا کام لیا ہے، اکثر اس آگ کا استعمال ظلم اور ظالم کو جلا کر خاک کر دینے کے لیے کیا ہے۔ جذبات کے اس طوفان نے تفکرات کے سوتے پر دھول اور مٹی کی اتنی دبیز چادر ڈال دی ہے کہ شین کی ناول نگاری آرٹ کا اعلیٰ نمونہ بننے سے محروم رہ گئی ہے؛ لیکن شین نے جس خلوص کے ساتھ اپنی دنیا اور اپنے لوگوں کے مسائل کو پیش کیا ہے وہ انہیں ایک سچے اور عظیم فنکار کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ریڈیائی ڈرامے

شین مظفر پوری کے ادبی ذخیرے میں ریڈیائی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ''خون کی مہندی'' کے عنوان سے ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ نومبر ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں سات ڈرامے شامل ہیں۔ یہ تمام ڈرامے انہوں نے آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ کے لیے تحریر کئے اور سب کے سب آکاشوانی، پٹنہ سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ 'خون کی مہندی' ان سب میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آکاشوانی، پٹنہ سے سب زیادہ بار نشر ہونے کا ریکارڈ اسی ڈرامے کے نام ہے، حالانکہ خود شین مظفر پوری اس ڈراما کی صدابندی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے کتاب کے 'حرفِ اوّل' میں کیا ہے:

> ''ایک دشواری یہ ہے کہ یہاں (آکاشوانی، پٹنہ) اردو کی نسوانی آوازوں کا قحط محسوس ہوتا ہے۔ غیر اردو صداکاروں سے لب ولہجہ، تلفظ، روانی اور فطری ادائیگی کے معاملے میں اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ لے دے کر معروف اردو صداکار محترمہ سعیدہ وارثی ہیں اور دوسری (غنیمت حد تک) شریمتی جے شری۔ شریمتی ستیہ سہگل اور شریمتی منورما باوا نے روانی اور ادائیگی تو دی مگر لہجے کی 'پنجابیت' نے ذرا بے مزہ کیا۔ اردو صداکاروں کی کمی میں قصور دراصل اس جھجک اور گریز کا ہے جو اردو آواز کے نسائی جوہر (Female Talent) کو ریڈیو کی طرف راغب نہیں ہونے دیتا۔'' (''خون کی مہندی'')

مذکورہ بالا جملوں میں جس صدائی بحران کا ذکر شین مظفر پوری نے کیا ہے۔ یہی صدابندی دراصل ریڈیائی ڈراموں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ریڈیو ڈراما کی کامیابی و ناکامیابی کا انحصار کرداروں کی آواز پر ہوتا ہے۔ یہاں آواز کے زیر و بم سے منظر ابھارے جاتے ہیں۔ اسٹیج ڈراما اور ریڈیائی ڈراما میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسٹیج ڈراما میں آواز کے ساتھ چہرے کے تاثرات وجسم کے حرکات بھی اپنا تاثر قائم کرتے ہیں، جب کہ ریڈیائی ڈرامے میں ہماری سماعت ہی ہماری بصارت کا بھی کردار ادا کرتی ہے۔ سامع اپنے تخیل میں آواز کے سہارے ہی مناظر اور واقعات کو محسوس کرتا ہے؛ بلکہ اپنے طور پہ غائب (سین) کو حاضر دیکھتا ہے۔ بقول عشرت رحمانی:

> ''ڈراما خواہ اسٹیج کا ہو، یا ریڈیو کا بہ حیثیت فن اس میں تمام ڈرامائی لوازم کا ہونا ضروری ہے۔ گو اسٹیج ڈراما میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن ریڈیو ڈراما میں وہ حرکات وسکنات آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی؛ اس لیے موالذکر کی خصوصیات میں لوازم بدرجہ اتم ضروری قرار پاتے ہیں، جو نظر آئے بغیر صرف کانوں کے ذریعہ سامعین کو متاثر کر سکیں اور سماعت ان سے وہی لطف بصیرت حاصل کر سکے، جو اسٹیج پر بصارت کے ذریعہ ممکن ہو۔''

(''اردو ڈراما کی تاریخ وتنقید''، عشرت رحمانی)

''خون کی مہندی'' میں شامل 'سو کا نوٹ'، 'انٹرویو کا چکر'، 'سرکس کا شیر'، 'خون کی مہندی'، 'تیسری آنکھ'، 'انوکھی بات' اور 'بے چارہ شاعر' میں سے اکثر شین کی کہانیاں ہیں، جسے انہوں نے ریڈیائی ڈرامے کا روپ دیا ہے۔ تمام ڈرامے ان معنوں میں اہم ہیں کہ ان میں سامعین کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام پوشیدہ ہے۔ کتاب کا پہلا ڈراما ''سو کا نوٹ'' 'مڈل کلاس فیملی کے لیے سو کے نوٹ کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مزاحیہ انداز میں لکھا ہوا یہ ڈراما تفریح سے بھرپور ہے۔ چست مزاحیہ جملے ادبی چاشنی لئے ہوئے ہیں۔ تجسس قائم رکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا ڈراما ''انٹرویو کا چکر'' مزاحیہ پیرائے میں نیتاؤں پر طنز ہے۔ میاں بیوی دونوں ایک ہی حلقے سے انتخاب میں امیدوار ہیں۔ گھر کی لڑائی سڑک تک آ گئی ہے؛ مگر جنتا سب جانتی ہے اور دونوں کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ ڈرامے میں اخبار نویسوں پر بھی گہرا طنز کیا گیا ہے۔ تیار شدہ تقاریر اور انٹرویو ان کے پاس ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں۔ جاہل نیتاؤں کو صرف قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور وہ ان کے نام سے شائع ہو جاتا ہے۔ تیسرا

ڈراما ''سرکس کا شیر'' شگفتہ نام کی شہ زور بیوی اور اس کے شوہرِ نامدار کی کہانی ہے۔ شگفتہ اپنی دولت کا رعب اپنے شوہر اور ان کے اہلِ خانہ پر گانٹھتی ہے۔ ان کو حقیر وفقیر گردانتی ہے۔ نتیجتاً ازدواجی زندگی تو جہنم بن گئی ہے، پورا خاندان تباہی کی زد میں ہے۔ مصنف نے پوری سچویشن کو بڑے ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈرامے میں ڈراما کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چوتھا ڈراما ''خون کی مہندی'' ان کا مقبول ترین ڈراما ہے۔ جہیز کی لعنت کو پیش کرتا یہ ڈراما ایک ٹریجڈی ہے۔ پورا قصہ امید وناامیدی کے درمیان ارتقا پذیر ہوا ہے۔ اختتام میں لڑکی کی موت نے پوری فضا کو مزید بوجھل اور کربناک بنا دیا ہے۔ یہ ڈراما ہمارے معاشرے پر ایک سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ موضوع میں یکسانیت کے باوجود مذکورہ بالا دونوں ڈرامے اپنی پیش کش کے لحاظ سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں ڈرامے کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے، جتنی اس دور میں تھی کہ جہیز کی لعنت بدستور جاری ہے۔

''تیسری آنکھ'' میں 'جیسی کرنی ویسی بھرنی' والی کہاوت بہ روئے کار لائی گئی ہے۔ ملاوٹ کے سامان بیچ کر دولت کے انبار تو لگائے جاسکتے ہیں؛ مگر ایسے لوگ جب خود اس کا شکار ہوتے ہیں تو ان کی ساری کالی کمائی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وہ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ اپنے گناہوں پر لاکھ پردہ ڈال دیجیے؛ مگر 'تیسری آنکھ' سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہتا، وہ سب دیکھتی ہے۔ ''انوکھی بات'' میں پشتینی دشمنی کو دکھلایا گیا ہے؛ مگر ایک شخص کی عقل مندی اور دور اندیشی سے یہ دشمنی دوستی میں متبدل ہو جاتی ہے۔ دو خاندانوں کے درمیان برسوں سے چلی آ رہی دشمنی کو حیدر علی خاں نے اپنی فراست سے آڑے وقت میں اپنے دشمن شیر علی خاں کی خاموشی سے کچھ اس طرح مدد کی کہ وہ نہ صرف اس کا اپنا احسان مند؛ بلکہ دوست بنالیا۔ یہ ڈراما جہاں موروثی عداوت پر ایک کاری ضرب ہے، وہیں نئی نسل کی مثبت سوچ اور تعمیری ذہن کا اشاریہ بھی ہے۔

مجموعے کا آخری ڈراما طنز ومزاح کے پیرائے میں ان شعرا کی آپ بیتی ہے، جن کی پوچھ نہ گھر میں ہوتی ہے اور نہ باہر ہی پذیرائی نصیب ہوتی ہے۔ گھائل عظیم آبادی کی ان پڑھ بیوی الاّ رکھی کس طرح اس کے لیے عذاب جان بن گئی ہے۔ اس کی عمدہ تصویر کشی اس ڈرامے میں کی گئی ہے۔ ذہنی ہم آہنگی کے بنا ازدواجی زندگی کیا دن دکھاتی ہے، آپ بھی دیکھیے:

الاّ رکھی : (صلح کے موڈ میں) ہاں وہ کیا چیز ہے؟ تم کسی چیز کی بات کر رہے تھے نا؟

گھائل : (خوشی سے پھڑک کر) ہاں ہاں۔ وہ ایک چیز۔ سنو گی تو پھڑک جاؤ گی۔ (ذرا رکتا ہے) واللہ (شعر پڑھتا ہے)

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

الاّ رکھی : (ایک دم سے بھڑک جاتی ہے) کیا کہا۔ گالیاں؟ تم مجھے گالیاں دو گے۔۔۔۔ گالیاں؟ ابھی پہلے بھی تم کچھ گالی والی کی بات کر رہے تھے۔

گھائل : (گڑبڑا کر) نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔

الاّ رکھی : (ویسے ہی جھڑک کر) تو کیا میں نے تمھیں گالیاں دی ہیں؟

گھائل : (سٹ پٹا کر) نہیں بھائی........

الاّ رکھی : (بات کاٹ کر) ہیں۔ یہ بھائی بھائی کیا۔ میں تمہاری بیوی ہوں بھائی نہیں۔

گھائل : (کوفت کے ساتھ سمجھانے کے انداز میں) افوہ۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ مطلب یہ ہے کہ غالب کی محبوبہ نے اس کے رقیب کو گالی دی ہوگی۔ اب رقیب کے معنی کیا بتاؤں۔ یوں سمجھو کہ کوئی دوسرا تم پر عاشق ہو جائے تو وہ میرا رقیب ہوگا۔

الاّ رکھی : (نفرت سے) توبہ توبہ۔ چھی چھی۔ کیا واہیات خرافات بکتے ہو۔

گھائل : (ہار مان کر) اچھا بھائی......

الاّ رکھی : (جھٹ بات کاٹ کر) پھر بھائی؟

گھائل : اچھا بی بی۔ میں اس شعر کو بلکہ ساری بات کو واپس لیتا ہوں۔''

(''خون کی مہندی'')

ان ڈراموں کے مکالمے اتنے جاندار، چست درست اور بے ساختہ ہیں کہ ریڈیو پر نشر ہونے کے بعد سامع کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ ڈراما دیکھ نہیں رہا؛ بلکہ سن رہا ہے۔ ریڈیائی ڈراموں کی تاریخ میں شین کے یہ ڈرامے اپنی برجستگی، شوخی اور متانت کے باعث ہمیشہ نمایاں نظر آئیں گے۔

غیرافسانوی نثر

طنز ومزاح نگاری: آدھی مسکراہٹ

فکشن نگاری کے باب میں شین مظفر پوری نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان سے پوری ادبی دنیا واقف ہے۔ مگر غیرافسانوی نثر نگاری کی دنیا میں انہوں نے جو جواہر ریزے بکھیرے ہیں ان سے عام لوگ ذرا کم باخبر ہیں۔ طنز ومزاح، انشائیہ اور خاکہ پر مبنی ان کے دو مجموعے: ''آدھی مسکراہٹ'' (۱۹۸۰ء) اور ''حکایت نامہ'' (۱۹۹۳ء) ادبی حلقوں میں داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں اور آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ''آدھی مسکراہٹ'' کے پیش لفظ جو ''خودنوشت'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے میں شین لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء کے تقسیم وطن کے بعد ایک دوسری ہی دنیا سے پالا پڑا۔ زندگی اور سماج کا ماحول ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ قلم کو نشتر اور زبان کو دھار بنانے میں مابعد ۱۹۴۷ء کے سیاسی وسماجی عوامل ومحرکات کی بھی کارفرمائی رہی ہے۔ ذہن وفکر نے نئی نئی کروٹیں لیں۔ تاریخ کے بدلے ہوئے دھارے اور نئی سماجی آب وہوا میں درجنوں افسانے اور کئی ناول لکھے۔ سلسلہ جاری ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے نئے دور میں گاہے گاہے کچھ ایسی تخلیقات بھی ہوئیں جو محض افسانہ کے زمرے میں نہیں آتیں۔ ان چیزوں کو (میرے خیال میں) طنز ومزاح، انشائیہ اور خاکہ کے خانوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں

کا ایک انتخاب نہایت عجز اور تذبذب کے ساتھ کتابی صورت میں 'آدھی مسکراہٹ' کے نام سے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ 'آدھی مسکراہٹ' سے مراد 'ادھوری مسکراہٹ' ہے۔ کیوں کہ بقیہ آدھی مسکراہٹ سے زندگی محروم ہو چکی ہے۔'' (''آدھی مسکراہٹ'')

اس اقتباس کو پیشِ نظر رکھ کر میں دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ شین نے 'آدھی مسکراہٹ' میں شامل اپنی نگارشات کو طنز ومزاح، انشائیہ اور خاکہ سے تعبیر کیا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ 'آدھی مسکراہٹ' میں شامل ۱۵ رتحریروں میں سے ایک بھی انشائیہ کے ذیل میں نہیں آتی ہے، البتہ 'حکایت نامہ' میں جو ۱۷ رفن پارے یکجا کیے گئے ہیں، ان میں 'پٹنہ کی سڑک کا ایک خط'، 'ایک لاکھ'، 'عورت کی زبان' اور 'خودنوشت خاکہ' کو انشائیہ کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں اکثر مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ صنفی اعتبار سے مزاحیہ مضمون اور انشائیہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مزاحیہ مضمون میں مضمون نگار مرکزیت پر قائم رہتے ہوئے طنز ومزاح کے گل بوٹے کھلاتا ہے۔ ہنسنے ہنسانے کے عمل سے گزارتے ہوئے طنز کے کڑوے گھونٹ پلا جاتا ہے، یہاں طنزیہ اور مزاحیہ جملے مربوط انداز میں اپنی جلوہ گری سے محظوظ کرتے ہیں، جب کہ انشائیہ نگار باطن کی پوشیدہ زیریں لہروں سے دائرہ در دائرہ بناتا ہے۔ بقول وحید قریشی:

> ''جب ذہن کو کھلی چھوٹ دے دی جاتی ہے تو پھر جذبات میں عجیب سے قوس وقزح بنتی چلی جاتی ہے۔ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ ان کا حسن اور بانکپن ان کے اچانک در آنے میں ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ اچانک شب خون انشائی ادب کا ترجمان ہے۔ ذہن کو یک لخت نئی دنیا میں ڈالنا اس ادب پارے کا نام ہے...... انشائیہ نگار، زندگی کا مبصر ہے، زندگی کا مفسر نہیں ہے۔''

(''اردو کا بہترین انشائی ادب'')

مزاحیہ وطنزیہ مضامین اور انشائیہ میں فرق کے باوجود عموماً مزاح پر انشائیہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ میں غیر شعوری طور سے مزاح کے عناصر در آتے ہیں۔ یہ شوخ ظریفانہ رنگ قاری کو مزید فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شین مظفر پوری کی افسانوی زبان، چست مزاحیہ جملے اور تیکھے طنزیہ انداز کے سبب اکثر لوگ انشائیہ اور مزاحیہ مضامین کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ جس کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ شین کے اس جملے کہ ''آدھی مسکراہٹ سے مراد ادھوری مسکراہٹ ہے؛ کیوں کہ بقیہ آدھی مسکراہٹ سے زندگی محروم ہو چکی ہے۔'' سے عیاں ہے۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شین کی پوری زندگی محرومیوں اور عسرتوں سے عبارت رہی ہے، لہٰذا شین کے یہاں طنز کا جو عمل ہے، وہ ایک پیچیدہ نفسیاتی Phenomenon کا نتیجہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے ہی ان کی تحریروں میں طنز کے عناصر کبھی شدت تو کبھی نرم روی کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں۔ابتدائی تحریروں میں طنز کا یہ انداز گراں بھی گزرتا ہے؛ مگر رفتہ رفتہ شین نے طنز کے تیکھے تیور کو مزاح کی چاشنی میں ڈبونے کا معتدل رویہ اپنا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شین کے قلم نے طنز و مزاح کی وہ بستی آباد کی، جہاں کی سیر کے بعد انسان اپنا محاسبہ کرنے کو مجبور ہوتا ہے کہ کہیں اس کی آدھی مسکراہٹ بھی تو کسی نے نہیں چھین لی ہے؟ دراصل شین کے یہاں جو بچی ہوئی آدھی مسکراہٹ ہے وہ ایک فنکار کی باطنی مسرت کا مظہر ہے، یہی مسکراہٹ شین کو جینے کا حوصلہ دیتی رہی اور ان کے رخ روشن پر زیر لب ابدی تبسم کی شکل میں تا حیات منور بھی رہی۔اس حوالے سے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے ایک مضمون میں نہایت بلیغ اشارہ کیا ہے:

''اسلوب کی یہ صورت جس میں طنز کا پہلو حاوی ہے، اس شخصیت کے اظہار سے عبارت ہے، جسے عمر بھر اپنی ناقدری کا ملال رہا۔غالبؔ نے تو، ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے، کہہ کر گویا حرف شکایت زبان پر لا دیا اور اپنی ہنرمندی کا اظہار بھی کر دیا؛ مگر شین مظفرپوری شکایت نہیں کرتے؛ بلکہ خندہ زن ہوتے ہیں اور کبھی طنز کرتے ہیں۔ایک پہلو اور ہے، جس کی یہاں وضاحت ضروری ہے۔شین کو بھی اپنی ہنرمندی پر یقین ہے؛ مگر اپنی ناقدری کا سبب وہ اپنی بد دماغی کو نہیں تنگدستی اور بدحالی کو قرار دیتے ہیں اور اپنی اس ذاتی محرومی کو ایک عمومی صورت حال کا اشاریہ بناتے ہیں۔''

(''شین مظفرپوری کی تحریروں میں طنز کے عناصر''، مشمولہ جریدہ۔۱، شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفرپور)

پروفیسر ارشدؔ کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ شین نے زمانے اور وقت کے ہاتھوں ملے زہر ہلاہل کو شکر کی طرح پی لیا اور ہونٹوں پر آدھی مسکراہٹ سجائے طنز و مزاح کو ایک اعتدال کی صورت عطا کی۔درحقیقت یہی شین کے طنز و مزاح کا اصل رنگ و آہنگ ہے، جو 'آدھی مسکراہٹ' اور 'حکایت نامہ' میں جا بجا موجود ہے۔

شین مظفرپوری اپنے ظریفانہ مضامین کے لیے مواد اپنے معاشرے، اپنے روزمرہ اور اپنے آس پاس سے اخذ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ سیاسی احوال اور بعض دفعہ ادبی سرگرمیوں سے بھی مزاح کی فضا تیار کرتے ہیں، 'آدھی مسکراہٹ' میں شامل پہلے دو مضامین ''وائف کو بخار آیا'' اور ''بیوی ایک عدد'' میں ازدواجی زندگی کے تلخ و شیریں ایام کے سہارے طنز و مزاح کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ قاری مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتا۔وہ لطف و انبساط کی ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے، جس کی تلاش آج کے مشینی عہد میں ہر فرد کو ہے۔اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ایک بخار ہی ایسا مرض ہے جسے وائف کے معاملے میں استثنا کا شرف حاصل ہے، ورنہ جہاں تک بیویوں کے دوسرے پیٹنٹ امراض کا تعلق ہے ماشاءاللہ اپنی وائف بھی کسی کی وائف سے پیچھے نہیں۔مثلاً دردسر اور ہاضمہ کی خرابی وغیرہ۔یعنی ہر وہ مرض جس کی تشخیص نہ طبیب کر سکے اور نہ جس کا ایکسرے ہو سکے یا تو وائف کے بیان حلفی پر اعتبار کیجیے، یا مرض، یا مرض کے Face Value (یعنی حیثیت عرفی) کو تسلیم کیجیے۔''

☆

''بخار کے معاملے میں وائف کی دیرینہ حسرت کا بیک گراؤنڈ یہی ہے۔میرا بخار دیکھ کر انہیں ہمیشہ یہی گمان گزرا کہ بخار میں یقیناً مسرت و شادمانی کا کوئی راز پوشیدہ ہے، جسے میں چھپایا کرتا ہوں۔وہ ہمیشہ ترستی رہیں، کاش کبھی انہیں بھی بخار آتا؛ تاکہ اس کے اسرار و رموز ان پر روشن ہو جاتے؛ لیکن بخار کو بھی ان سے کیا پرخاش تھی کہ ظالم نے انہیں کبھی چھوا تک نہیں۔آخر برسوں کی منت و آرزو کے بعد بخار نے ان سے رجوع کرنے کا قصد کیا۔''

☆

''حاصل سبق یہ کہ وائف بھی ایک قسم کے بخار کا ہی نام ہے جو ایک بار چڑھ جائے تو ساری زندگی اترنے کا نام نہیں لیتا —— بلکہ بعض لوگوں کے لیے کالا بخار بھی ثابت ہوتا ہے۔'' (''وائف کو بخار آیا'')

یہاں شین صاحب نے اپنے خاص انداز میں رعایت لفظی اور طنزیہ فقروں کی مدد سے مشہور کہاوت ''کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھول گیا'' اور غالبؔ کے مصرع ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے۔

شین پر یہ اعتراض اکثر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یادگار کردار خلق نہیں کیے۔ان حضرات کو شین کی ظریفانہ تحریر ''منشی مرحوم'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔شین نے ایک نہایت عمدہ اور نا قابل فراموش کردار تخلیق کیا ہے اور اس کے پس پردہ ایسے شعرا پر طنز کیا ہے جو سادہ کاغذ پر اصلاح لیتے ہیں اور 'کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا' کے مصداق زندگی گزارتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ منشی مرحوم کا کردار اردو کے مزاحیہ ادب میں چچا چھکن کی طرح یادگار کردار کی حیثیت رکھتا ہے؛مگر یہ ہماری کم نظری ہے کہ ہم نے اسے بھلا رکھا ہے۔مضمون کے آخری سطور پڑھ کر آپ مجھ سے اتفاق کریں گے:

''منشی مرحوم ہکا بکا ہو کر بیوی کا منھ تکنے لگے،کچھ کہنا چاہا تو منشیائن نے گرج کر روک دیا''میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔اخبار یا بیوی دونوں میں سے کوئی ایک چن لو۔''

''بڑھاپے میں بیوی کے اس انقلابی اقدام پر منشی مرحوم لرز اٹھے۔ناک کٹنے کے ڈر سے جھرجھری آ گئی۔نیازمندی سے سر جھکا کر زیر لب بولے''چلو توبہ کرتا ہوں باقی زندگی تم کو پڑھنے میں گزار دوں گا۔

''شام کو لوگوں نے دیکھا کہ منشی مرحوم سر جھکائے مصلا اور تسبیح خرید کر سیدھے گھر کا رخ کئے چلے جا رہے ہیں۔کسی نے آواز بھی دی تو سنی ان سنی کر دی۔ہوٹل اور چائے خانے کے سامنے سے گزر گئے؛مگر نظر تک نہ اٹھائی اور تیسرے دن سے منشی مرحوم میں صحت کے آثار نمودار ہونے لگے۔''(''منشی مرحوم'')

شین مظفر پوری نے ادبی فضا اور ادیبوں کی حیات کو پس منظر میں رکھ کر کئی عمدہ مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ان میں اشعار کے برمحل استعمال سے ایسی ظریفانہ منظرکشی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔''قصہ ایک شاعر کا'' اور ''حاصل مشاعرہ'' اسی نوع کے مضامین ہیں۔یہاں اسلوب کی تازگی اور پیش کش کی ندرت نے طنز و مزاح کی لو کو ذرا اور بڑھا دیا ہے۔''قصہ ایک شاعر کا'' سے منتخب یہ اقتباس اس کی بین مثال ہے:

''کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

شعر سننا تھا کہ اللہ رکھی ہتھے سے اکھڑ گئی۔آگ بگولہ ہو کر شیرنی کی طرح دھاڑی''کیا کہا— گالیاں؟— تم مجھے گالیاں دو گے؟— گالیاں!''

''اب تو بے چارہ آنسو عظیم آبادی گھگھیانے لگا''نہیں نہیں میری جان،میرا یہ مطلب نہیں— میرا مطلب— میں— میں.........''

''تو پھر کیا میں نے تمہیں گالیاں دی ہیں۔'' دوسرا سوال تھا۔

نرغے میں آئے ہوئے آنسو نے سر پیٹ لیا اور غالب پر لعنت بھیجنے لگا جو ایسا واہیات سا فتنہ انگیز شعر کہہ گیا تھا۔اس نے شاید سب حسینوں کو اپنی معشوقہ چودھویں بیگم جیسی ذہین سمجھا ہوگا۔یہ نہ جانا ہوگا کہ کسی زمانے میں ایک اللہ رکھی کے سامنے بھی یہ شعر پڑھا جائے گا۔خیر بے چارے آنسو عظیم آبادی نے رڈبلا کی دعائیں پڑھ پڑھ کے معاملے کو کسی طرح رفع دفع کیا،ورنہ واقعہ سنگین رخ اختیار کر گیا ہوتا۔''(قصہ ایک شاعر کا)

صحافت کے پیشے سے وابستگی کے سبب شین اخباروں کے لیے ظریفانہ مضامین لکھتے رہے۔اخباروں کے لیے لکھے گئے ان مضامین اور خالص ادبی نوعیت کے مزاحیہ مضامین میں نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ صحافتی مزاحیہ تحریر ان ہنگامی حالات کی دین ہوتی ہے،جو کسی خاص موقع،یا واقعے سے نسبت رکھتی ہے۔وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی دلکشی ماند پڑنے لگتی ہے،جب کہ خالص ادبی نوعیت کا طنز و مزاح زندگی کے ان مضحکہ خیز پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے،جس کی بنیاد عالم گیر انسانی حماقتوں پر ہوتی ہیں۔یہاں تخلیق کار کے پیش نظر کسی کو ہنسنے ہنسانے کی لازمیت نہیں ہوتی،جب کہ صحافت کے لیے تخلیق کردہ مضامین میں قاری کی تفریح کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔سیاسی پس منظر میں لکھے گئے''الیکشن سے الیکشن تک''،''پولیٹیکل وائف''،''سیاسی چمچے''،''ایک کنڈیڈیٹ کی ڈائری'' کے علاوہ ''ملک الموت سے انٹرویو'' اور ''بیمار مسیحا'' اسی طرز کے مضامین ہیں؛مگر شین نے یہاں بھی فنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا ہے اور ان ہنگامی موضوعات کو بھی ایک آفاقیت بخش دی ہے۔آج کے سیاسی ماحول اور انتخابات کے دوران یہ مضامین اپنی پوری معنویت کے ساتھ آپ کے لیے فرط وانبساط کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور ہمارے جمہوری اقدار پر سوالیہ نشان بھی لگاتا ہے۔سیاسی چمچے سے ماخوذ یہ جملے سیاست کی مکاریاں آپ پر عیاں کر دیں گے:

''اس سارے ڈرامے کی سب سے حیرت انگیز تکنیک یہ تھی کہ والد صاحب درپردہ لالہ بھیکا رام کے بھی ورکر تھے؛لیکن درحقیقت وہ دونوں میں سے کسی کے بھی ورکر نہیں تھے۔وہ صرف ''لالہ نقد نارائن'' کے ورکر تھے!اور لالہ نقد نارائن کو والدہ صاحبہ

کی حمایت حاصل تھی۔اس لیے والد صاحب کی ساری گرمیاں انہی لالہ نقد نارائن کے حق میں رہیں‘‘۔(سیاسی چمچہ)

خاکہ نگاری: حکایت نامہ

’حکایت نامہ‘ میں شامل شین مظفر پوری کا ’’خودنوشت خاکہ‘‘ ان کی مقبول ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔اس تحریر کے حوالے سے میں قبل عرض کر چکا ہوں کہ اس کو ’انشائیہ‘‘ کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے، یہاں اپنی ذات کو نشانہ بنا کر شین نے جھیل کے مانند ساکت؛ بلکہ بے حس اجتماعی شعور میں ایک کنکڑ اچھال دیا ہے۔ نتیجے میں دائرہ در دائرہ جو ارتعاش پیدا ہوا ہے، وہ ایک طرف شین کے بالیدہ تخلیقی شعور کو درشاتا ہے تو دوسری جانب اسے انشائیہ کے زمرے میں لا کھڑا کرتا ہے؛ کیوں کہ بقول انور سدید:

’’انشائیہ نگار کی ذات ہر موضوع کے لمس سے اپنی ذات کی گرہیں کھولتی ہے اور خود کو قاری پر منعکس کرتی چلی جاتی ہے۔‘‘(’’اردو کا نسائی ادب‘‘)

مضمون، یا انشائیہ سے پرے میرے نزدیک شین کا یہ ’خودنوشت خاکہ‘ ایک نوحہ ہے۔ایک ادیب کی ناقدری کا، اس کی تہی دامانی کا، اس کی انا و خودداری کا اور سب سے آخر میں ہماری بے حسی کا۔ چند سطور پیش خدمت ہیں:

’’ایک حقیقت پسند اور مقام شناس ادارہ ’مفید الادب فلاح الادیب‘ موجود ہی ہے، جہاں موصوف پورے مہینے تو افسران بالا کے ہم دوش و ہم نشیں رہتے ہیں؛ مگر تنخواہ کے دن چپراسیوں کی قطار میں کھڑے ملتے ہیں، وہ بھی آگے نہیں؛ بلکہ دو تین کے پیچھے۔‘‘(خودنوشت خاکہ)

یہاں تضحیک، تمسخر اور طنز کی نشتر زنی صاف محسوس کی جا سکتی ہے، بظاہر یہاں شین نے اپنا خاکہ اڑایا ہے؛ مگر درحقیقت انہوں نے زندگی کی تلخیوں، نامحرومیوں اور ناہمواریوں کا ہمیں سنجیدہ ادراک کرایا ہے۔اظہار کی جادوگری نے قاری کو شین کا ہمنوا اور ہمدرد بنا دیا ہے۔ یہ شین کی فنی عظمت کا روشن ثبوت ہے۔

’حکایت نامہ‘ میں مذکورہ ’خودنوشت خاکہ‘ کے علاوہ چار اور خاکے شامل ہیں۔ان میں دو

خاکے سنجیدہ نوعیت کے تو دو مزاحیہ انداز کے ہیں۔دو سنجیدہ خاکے انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر سید نذر امام اور ابراہیم ہوش کی موت پر لکھا ہے، جب کہ بقیہ دو ظریفانہ رنگ کا حامل خاکہ ایک ہی شخصیت مولانا بیتاب صدیقی کی ذات اقدس پر تحریر فرمایا ہے۔’’حضرت مولانا‘‘ (حصہ اول) اور حضرت مولانا (حصہ دوم) کے عنوان سے پیش کردہ خاکے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شین صاحب کی نگاہ میں مولانا بیتاب صدیقی کی ذات و صفات کس قدر اہمیت کی حامل تھی۔

ڈاکٹر سید نذر امام جہاں ایک مقبول ماہر چشم تھے۔وہیں ابراہیم ہوش مشہور شاعر اور صحافی تھے۔ان دونوں سے شین کا رشتہ بے حد جذباتی اور قلبی تھا۔ابراہیم ہوش تو خیر سے شین کے ہم پیشہ تھے؛ مگر ڈاکٹر نذر امام حیثیت، مرتبہ اور پیشہ تینوں اعتبار سے خاکہ نگار سے بالاتر تھے۔اس کے باوجود شین سے ان کی دوستی اس مقولہ کے مصداق تھی کہ ’دوست نہ جانے جات کجات‘۔اسی طرح مولانا جیسے عام اور معمولی شخص پر دو دو خاکے تحریر کرنا خاکہ نگاری کے اس بنیادی وصف پر دال ہے کہ خاکہ کسی بھی شخصیت کا لکھا جا سکتا ہے۔اس کے لیے بڑا، یا شہرت یافتہ ہونا ضروری نہیں۔اصل بات کسی شخصیت کے اندر موجود وہ صفات ہیں، جو دوسروں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔

’’آب گینہ ٹوٹ گیا‘‘ کے عنوان سے ڈاکٹر نذر امام پر تحریر کردہ خاکہ ماجرا نگاری، انداز بیان اور پیش کش کے اعتبار سے بہترین فنی نمونہ ہے اور اپنے اندر سوز و ساز کی زیریں لہریں سمیٹے مانند دریا رواں دواں ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس نذر امام کے اندر موجود اعلیٰ صفات، ارفع اقدار، عظمت و سربلندی، عجز و انکسار اور سادگی و بے تکلفی کا پتہ دیتا ہے:

’’میں ذرا اپنی گوناگوں اور پریشان مصروفیات و نیز اپنے ناگفتہ بہ شبانہ یوم مسائل کے سبب ان سے ملنے کم ہی جاتا تھا۔وہی زیادہ آتے تھے۔بار بار مایوس لوٹ جاتے پھر بھی بار بار آتے رہتے اور جب ملاقات ہو جاتی تو بس نہ پوچھئے، ان کی خوشی کا کیا عالم ہوتا۔کبھی کبھی دیر اور کبھی گھنٹوں بیٹھے، لیٹے باتیں کرتے رہتے۔ ہر ملاقات میں میرے ساتھ کچھ کھانے، یا کم از کم چائے پینے کو لازمی سمجھتے۔اس معاملے میں بڑے سادہ اور بے تکلف تھے۔ادنیٰ سے ادنیٰ ہوٹل، یا چائے خانے میں بیٹھ جانے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔‘‘(’’آبگینہ ٹوٹ گیا‘‘)

کہا جاتا ہے کہ خاکہ نگار جس شخصیت کو اپنا موضوع بناتا ہے، اس کے تمام اوصاف کو اظہر من

الشمّس نہیں کرتا؛ بلکہ ان پہلوؤں کو طشت از بام کرتا ہے، جو اس کی نظر میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ گویا اس کی زندگی کے چند گوشے سے پردہ اٹھا کر وہ دوسروں کو محوِ حیرت کر دیتا ہے۔ ابراہیم ہوش کا خاکہ لکھتے ہوئے شین نے اس مخصوص عہد کی ادبی، سیاسی، سماجی، معاشی نیز تہذیبی اقدار کی جو حقیقت پسندانہ مصوری کی ہے، خاکہ نگار اور ابراہیم ہوش دونوں کی زندگی کے لیے دستاویزی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ یارِ غار ہونے کے بعد بھی ابراہیم اور شین کے درمیان رشتوں میں جو ایک نازک سا فاصلہ ہے، وہ قابلِ دید ہے:

''حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے شعری، یا افسانوی تخلیقات کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ شاعر تو موقع پا کر (بلکہ موقع نکال کر) اجنبی کو بھی شعر سنا کر جاں بلب کر دیتا ہے، جب کہ مجھے یاد نہیں کہ ابراہیم ہوش نے کبھی اپنا ایک شعر بھی سنایا ہو مجھے۔ ادب، سیاست، صحافت کے علاوہ 'خرافات' تک پر ان سے گفتگو بہت ہوا کرتی تھی۔ ان کا علم اور مطالعہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ دیگر علوم کی معلومات بھی وسیع تھیں۔ میرا تو سب کچھ 'کام چلاؤ' کی حد تک پہلے بھی تھا، آج بھی ہے۔ کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے نکلتے تھے؛ مگر زیادہ دیر تک نہیں۔'' (''میرا یارِ غار ابراہیم ہوشؔ'')

''حضرت مولانا' کے عنوان سے دو حصوں پر مبنی مولانا بیتاب صدیقی کا خاکہ اس ہنرمندی سے تخلیق کیا گیا ہے کہ مولانا کی شخصیت کا اکثر گوشہ یوں ابھر کر سامنے آگیا ہے، گویا مولانا مسلّم ومجسم ہمارے روبرو ہیں۔ خاکہ نگاری کے باب میں شین کا یہ فنی کمال ان کے دلکش اسلوب، ظریفانہ حسّیت، معتدل طنزیہ رویے کا غماز ہے۔ طنز و مزاح سے لبریز اس خاکے میں درحقیقت شین نے مولانا کا بھرپور خاکہ اڑایا ہے؛ مگر کہیں بھی دل آزاری کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ یہ شین کے فن کی عظمت ہی ہے کہ مولانا کا خاکہ لکھ کر ان کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ حضرت مولانا (اوّل۔ دوم) سے منتخب دو اقتباسات سے آپ کو مولانا کی شخصیت، خدمت اور عظمت کا اندازہ ہو جائے گا:

''توبہ، بات سے بات نکلتی جا رہی ہے اور حضرت مولانا کا حلیہ بتانا، یاد ہی نہیں رہا، حالانکہ مولانا کی سیرت کی ابتدا ہی صورت سے ہونی تھی۔ خیر اب بیچ میں آکر حلیہ کی تفصیل میں کہاں پڑوں۔ اجمالاً عرض کرتا ہوں کہ مولانا کا حلیہ وہی ہے، جو عام طور پر اینگلو پرشین، یا ندوی مولویوں کا ہوا کرتا ہے۔ مونچھیں خش خشی، یا بقدرِ اشکِ بلبل۔ داڑھی

لہسن کی جڑ سے کچھ زیادہ، جس کو عرفِ عام میں چکّی داڑھی کہتے ہیں۔ تنگ موری کا پاجامہ اور موسم کے اعتبار سے ادلتی بدلتی ہوئی لمبی شیروانی، ٹوپی رائج الوقت، قد میانہ، رنگت سانولی سلونی، ناک چپٹی نہیں۔ دہانہ مردانہ، آنکھیں تیرِ نیم کش نہیں تو کچھ ایسی بری بھی نہیں۔ ہنسی ہم لوگوں کے لیے قابلِ برداشت؛ مگر کسی نازک حسینہ کے لیے اینٹی کلائمکس۔ مسکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ دانتوں کی ساخت دونوں ہونٹوں کے اتصال میں مانع ہے۔ آواز جدّن بائی مرحومہ یا اختری بائی فیض آبادی سے ٹکّر لینے والی؛ یعنی اُس مغنیہ جیسی جس نے پکّے گانوں کے اونچے سروں پر جی توڑ کر ریاض کیا ہو؛ مگر آپ مولانا کی آواز سن کر یہ شعر نہیں پڑھ سکتے ؎

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

کیوں کہ مولانا نے اپنی آواز کے ترنّم کو شاید زہر دے کر مار ڈالا ہے۔'' (''حکایت نامہ'')

☆

''حضرت مولانا کے نام کے ساتھ اردو کا نام اس لیے آتا ہے کہ انہوں نے (جیسا کہ مشہور ہے) اردو ہی کے ذریعے قوم کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ خدا جانے تحسین ناشناس قوم کو اس کی خبر ہے بھی کہ نہیں۔ ہاں اگر اردو کی قسمت بدلنے والا عجوبہ مولانا کے جیتے جی واقع ہو جائے تو قوم مولانا کی غیر مطلوب خدمات کا اعتراف آگے چل کر لے گی، ورنہ فی الحال تو حضرت نقار خانے میں طوطی کی آواز ہی ٹھہرے۔ ویسے وقت کے تیور اور ہوا کے رخ کا اشارہ ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی؛ بلکہ ہوگا یوں کہ حضرت موصوف دل میں داغِ تمنا لیے، اردو کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے (قلم کے منہ میں گھی شکر) جنت میں پہنچ جائیں گے، جہاں کی سرکاری زبان سنتے ہیں کہ عربی ہوگی۔ کیا عجب کہ وہاں بھی اگر حوروں اور شراباً طہورا وغیرہ کے مشاغل سے فرصت پائی تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کو پھانس کر انجمن ترقی اردو کی برانچ کھول کر بیٹھ جائیں اور یہ مطالبہ شروع کر دیں کہ ہم حوروں سے اردو غزل میں گفتگو کریں گے، پس اردو کو جنت کی ثانوی زبان قرار دیا جائے؛ مگر شرط یہ ہے کہ وہاں ان پر یہ شعر نہ صادق آنے پائے ؎

شکوہ یہ فرشتوں کو کم آمیز ہے مومن
حوروں کو شکایت کہ بہت تیز ہے مومن''

(''حکایت نامہ'')

حاصل کمال یہ کہ شین مظفر پوری نے طنز و مزاح کے معتدل رویے اور اسلوب کی گل فشانی سے خاکوں کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اردو خاکہ نگاری کو ایک نئی سمت اور رفتار عطا کرتا ہے۔

یادداشت: رقصِ بسمل

رقصِ بسمل شین صاحب کی یادداشت ہے، جسے انگریزی میں Memoir کہتے ہیں۔ ذہن نشیں رہے کہ یادداشت اور خودنوشت میں بیّن فرق ہے۔ یہ فرق تقریباً وہی ہے، جو ناول اور افسانہ کے درمیان ہوتا ہے۔ یادداشت مصنف کی زندگی کے کسی خاص دور کی عکاسی کرتا ہے، جب کہ خودنوشت اس کی مکمل زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ دونوں میں ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ خودنوشت میں مرکزی حیثیت مصنف کی ذات کو ہوتی ہے اور یادداشت میں مصنف کے گزرے شب و روز کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ رقص بسمل کے آغاز میں شاؔد کا یہ شعر درج ہے ؎

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یہ شعر بہت حد تک یادداشت (Memoir) کو بطور صنف Define بھی کرتا ہے، چونکہ شیںؔ نے اپنی اس حکایت ہستی کا رشتہ ماضی سے جوڑنے کی سعی میں ابتدائی چند صفحات اس طور سے رقم کیے ہیں کہ بعض حضرات کو اس کے خودنوشت ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ 'رقص بسمل' شین صاحب کی زندگی کے ۱۷ مہینوں پر مبنی وہ داستان ہے، جس کے اثرات ان کے ذہن و دل پر گہرے مرتسم ہوئے۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یوں کیا ہے:

''واقعات تو بہت گزرے ہیں، جن سے متاثر ہوا ہوں اور جو ناقابل فراموش ہیں؛ لیکن زندگی میں جو سب سے بڑا واقعہ گزرا ہے، وہ ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ ہے، جس سے میری پوری زندگی متاثر ہوئی؛ کیوں کہ میں اردو کا ادیب ہوں، جب میرا فن اور ذریعہ معاش متاثر ہوا تو میری پوری زندگی متاثر ہوئی۔''

ان سطور میں تقسیم ملک کا کرب ہی پنہاں نہیں ہے، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنی شناخت کے لٹ جانے کا درد بھی پوشیدہ ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۴۸ء تک پر محیط یہ قصہ شین مظفر پوری کے دہلی سے حادثتاً لاہور پہنچنے، وہاں قیام، پھر کراچی منتقل ہونے اور وہاں سے لوٹ کر اپنے آبائی وطن باتھ اصلی ضلع سیتامڑھی واپس آنے تک کا ہے۔ پورا قصہ اذیت ناک، ہولناک اور عبرت ناک ہونے کے باوجود اتنا دلچسپ اور پرکشش ہے کہ قاری ایک بار شروع کرتا ہے تو ختم کیے بغیر دم نہیں لیتا ہے۔ قصے کی جاذبیت میں واقعات کے نشیب و فراز کو جتنا دخل ہے، اتنا ہی شیںؔ کے انداز بیان کا طلسم بھی شامل ہے۔ گویا موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر رقص بسمل اردو کے نثری ادب میں امتیازی شان کی حامل تحریر ہے، چوں کہ شیںؔ مظفر پوری نے اپنی یہ یادداشت ماجرا گزرنے کے ۴۵ ربرسوں کے بعد رقم کی تھی، لہٰذا انہوں نے کئی جگہوں پر واقعات کے بھولنے، یا دھندلے ہونے کا اعتراف کیا ہے؛ مگر شیںؔ کا فنکارانہ اعجاز یہ ہے کہ انہوں نے ایک یا دو مقامات کے علاوہ کہیں بھی ربط و تسلسل کے ٹوٹنے کا گمان تک نہیں ہونے دیا ہے۔

''رقص بسمل، میرے نزدیک انسان اور انسانیت کی پامالی اور اشرف المخلوقات کے وحشی درندے میں تبدیل ہونے کا بہترین اشاریہ ہے، سیاست اپنے گھنونے کھیل کھیلتی ہے اور معصوم جانوں کا زیاں ہوتا ہے، اس کی عمدہ منظرکشی اس یادداشت میں کئی شقوں میں ہوئی ہے۔ کرب و اذیت میں مبتلا لاکھوں انسانوں کی بے کسی و بے بسی کی ایک تصویر شیںؔ نے یوں کھینچی ہے:

''پرانا قلعہ میں کئی مربع میل کے اندر ہزاروں انسان چیونٹیوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ ان کے چہرے خوف و ہراس اور خوراک کی کمی کے سبب رندے ہوئے تھے، بے خانمائی اور بے سروسامانی نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے، ہر طرف بے کسی اور یتیمی چھائی ہوئی تھی، لوگ ایک دوسرے کی طرف ہمدردی اور مظلومیت کی نظر سے دیکھ رہے تھے...... ان میں سے اکثر کے جسم پر کپڑے بھی سلامت نہ تھے، بچے والدین کی زندگی ہی میں یتیم نظر آ رہے تھے۔ چہرہ ویران، جسم منحنی، لباس میلے، بال گرد و غبار میں اٹے ہوئے۔ ان کا وجود قدرت اور قسمت کے نام پر گویا ایک مرثیہ تھا، ایک طنز تھا...... جوان عورتوں کا سہاگ ان کے شوہر کے جیتے جی اجڑا ہوا نظر آتا تھا، جن آنکھوں سے کبھی کاجل کی تحریر نہیں دھلتی تھی، ان میں سوگ اور جگرسوزی کا غبار ایک ویرانی سی پیدا

کیے ہوئے تھا، ان مستورات میں وہ گل بدن اور پردہ نشیں خواتین بھی تھیں، جن کے تلوے ہمیشہ قالینوں سے مس ہوتے رہے تھے؛ لیکن وہ خاک بہ سر اور برہنہ پا زمین پر لوٹ رہی تھیں، اس ہجوم میں وہ نازنین اور نازک دوشیزائیں بھی تھیں، جو ناہموار زمین پر چلنے سے بل کھا جاتی تھیں؛ لیکن آج شلوار کے پاجامے اوپر اٹھائے اور سروں پر پانی سے بھری ہوئی بالٹی لیے کپکپاتی ہوئی گردن اور اکڑے ہوئے جسم کے ساتھ آتی جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایسی ناز پروردہ اور عیش وراحت کے پنگوڑے میں جھولنے والی عورتوں کو بھی وہاں پانی کے گھونٹ کے ساتھ ڈبل روٹی کے سوکھے نوالے نگلتے دیکھا جو لذیذ ترین اکل وشرب کو بھی گویا زیر مار ہی کیا کرتی تھیں۔ ریشم کے لچھوں اور خوشبوؤں کی لطافتوں میں پلے ہوئے جسم گرد وغبار میں لوٹ رہے تھے۔ عصمت وعفت پر جان نچھاور کرنے والی وہ خواتین جن کی آواز بھی کسی نامحرم نے نہ سنی ہو آج ہزاروں کے ہجوم میں اپنی شرم وحیا کے جنازے پر خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ انتہا یہ کہ ہزاروں نامحروں کے سامنے وہ بے پردہ ہی فطری حوائج تک پوری کرنے پر مجبور تھیں۔ اپنی قومی حرمت وآبرو کو رسوائی، بے بسی اور بے چارگی کی اس منزل میں دیکھ کر دل روتا تھا۔ کلیجہ پھٹتا تھا اور رہ رہ کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ کربلا کے تصور نے بھی مجھے اس قدر متاثر نہیں کیا تھا۔ اس زندہ کربلا کو دیکھ کر روایتی کربلا کو بھول گیا۔''

قدرے طویل؛ مگر حقیقت کی یہ برہنہ تصویر تاریخ کا وہ سیاہ باب ہے، جس نے چند ناعاقبت اندیش سیاسی قائدین کے جذباتی فیصلے کی پاداش میں قوم کے بے شمار افراد کو لقمہ اجل بنا دیا۔ شیؔن دوقومی نظریہ کے یکسر مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہ حالت مجبوری جب انہوں نے حدود پاکستان میں قدم رکھا تو ایک شرمندگی اور غیرت ان کے وجود کو چھلنی کیے جا رہا تھا۔ لکھتے ہیں:

''میں نے ہمیشہ دوقومی نظریہ کی مذمت اور مطالبہ پاکستان کی تضحیک کی تھی۔ کچھ تو سچ مچ اور کچھ بطور فیشن! ہر چند کہ میرے جذبات ہندوستان کی طرف سے فی الحال گدلائے ہوئے تھے، پھر بھی میں اپنے نظریے پر قائم تھا اور اس سرزمین پر قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا، جس کی خاطر وہ سب کچھ ہوا، جس کے داغ دھبے صدیوں تک انسانیت کے دامن سے نہ چھوٹ سکیں گے، جس کی آلودگی سے آج بھی ہماری روحیں نہائی ہوئی ہیں، یہ

زمین کا وہی خطہ تھا جس کے نام پر گرنتھ، گیتا اور قرآن پر ایمان رکھنے والے لوگ، شیطان کو بھی شرمانے لگے۔ انسان کو بکرے کی طرح ذبح کیا۔ اس کے عضو عضو کو کاٹ کاٹ کر الگ کیا۔ برہنہ عورتوں کے جلوس نکالے۔ ان کی چھاتیاں کاٹیں، ان سے زنا کیا۔ ان کی شرم گاہوں کو نیزے اور برچھے سے زخمی کیا۔ یہ سلوک ان کے ساتھ ہوا، جنہیں یہی لوگ کبھی آپس میں ماں، بہن اور بیٹی کہا کرتے تھے اور ایسا اس لیے ہوا کہ ان سب کا مذہب خطرے میں تھا، ان کی تہذیب خطرے میں تھی۔''

وقت نے ثابت کر دیا کہ ملک کی تقسیم کا فیصلہ کتنا غلط، غیر دانشمندانہ اور غیر افادی تھا۔ جانی اور مالی نقصانات سے پرے پوری قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔ آزادی کی دو دہائی کے بعد ہی ان کے خوابوں کا وطن مزید دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور ہندوستان سے ہجرت کر کے گئے مسلمان نہ یہاں کے رہے، نہ وہاں کے رہے؛ مگر جو اپنے وطن کو چھوڑ کر نہیں گئے، ان کا مستقبل کتنا تابناک، یا تاریک ہے؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ شیؔن مظفر پوری نے اس جانب بے باک تبصرہ کرتے ہوئے جو پیشن گوئی آج سے تقریباً ۲۵؍ برس قبل کی تھی، کیا وہ آج سچ ثابت ہونے کی راہ پر گامزن نہیں ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جس کو انہوں نے دارالامان سمجھا تھا، وہی دارالحرب ثابت ہوا۔ وہ آج بھی شہریت اور وطنیت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کیا عجب کہ کبھی کبھی انہیں بھارتی مسلمانوں پر بھی رشک آتا ہو۔ ''دوسرا وطن'' اور ''تیسرا وطن'' کا مزہ چکھنے والے اکثر لوگ اب اس مسرت میں مرتے ہیں اور اس تمنا میں جیتے ہیں کہ اپنے آبائی وطن کی خاک میں جا ملیں؛ لیکن جن غیر جذباتی مسلمانوں نے ترک وطن نہیں کیا، انہوں نے بھی یہاں کیا پایا؟ سچی بات یہی ہے کہ ہندی مسلمانوں کو آج آئین اور قانون پورا تحفظ دینے سے قاصر ہے۔''

رقصِ بسمل میں صرف خوں آشام مناظر ہی نہیں ہیں؛ بلکہ شیؔن مظفر پوری کے دوست احباب (ادبی وغیر ادبی)، ان سے ان کے رسم وراہ اور معاملات، وقت کی کسوٹی پر کھرے اور کھوٹے ثابت ہوئے رشتوں کی کہانیاں اور لاہور وکراچی کی ان پر مسرت اور یادگار لمحوں کا بھی ذکر ہے، جن میں ہندوپاک کی بڑی ادبی شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ ان فنکاروں میں احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، قتیل شفائی، سیف الدین سیف، احمد راہی، قمر تسکین، ظہیر کاشمیری، عبدالحمید عدم، سورش کاشمیری، ساحر لدھیانوی، ابن انشاء، شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، قمر ہاشمی، اور مسعود

گوہر کے نام اہم ہیں۔ مشہور افسانہ نگار منٹو سے اپنی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''ایک دن قمر تسکین نے میرا تعارف سعادت حسن منٹو سے بھی کرایا۔ عینک سے جھلکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں والا منٹو، جس کے افسانے میں چبا چبا کر اور چٹخارے لے لے کر پڑھتا آیا تھا۔ میں کچھ مرعوب سا رہا۔ زیادہ باتیں نہ ہوسکیں۔ کچھ رسمی گفتگو ہی رہی۔ الفاظ یاد نہیں رہے صرف ''ارے یار'' یاد رہ گیا ہے اور یہ کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کہی تھی (بزرگانہ انداز میں) جس سے ظاہر ہوا کہ میرا نام ان کے لیے غیر مانوس نہ تھا اور یہ کہ میری افسانہ نگاری کے بارے میں لوگوں سے کچھ سن رکھا تھا (مطلب بدنامی کی بات)۔''

اسی طرح دہلی، لاہور اور کراچی سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل اور ان میں سے اکثر سے ان کی وابستگی کے قصے بھی جا بجا مذکور ہیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ ''ساقی'' کے علاوہ شمع، فلم لائٹ، آرٹسٹ، کامیاب، مشہور، آریہ ورت، کہکشاں، محشر خیال، خاتونِ مشرق، صوفی، دین دنیا، نگارخانہ، انوارِ سحر، تیج، جنگ، انجام وغیرہ اور لاہور سے نکلنے والے اخبارات ورسائل میں نیرنگ خیال، نوائے وقت، انقلاب، احسان، امروز اور چٹان کے حوالے سے وابستہ یادوں کا گاہے گاہے کہیں مفصل تو کہیں مختصر ذکر موجود ہے۔ قیام لاہور کے زمانے میں شینؔ صاحب کی ادارت میں ایک ہفت روزہ جاری ہوا تھا، جس کا بدقسمتی سے ایک شمارہ ہی شائع ہوسکا۔ اس کی تفصیل شینؔ یوں پیش کرتے ہیں:

''ایک صاحب بخش الٰہی، یا الٰہی بخش تھے۔ مقامی پنجابی نہایت ہنس مکھ اور نرم گفتار، کم تعلیم یافتہ تھے۔ کسی ذریعہ سے میرے پاس ان کا آنا جانا ہونے لگا۔ کاروباری ذہن کے آدمی تھے۔ میری ادارت میں ایک ہفتہ وار نکالنا چاہتے تھے، لہٰذا ''آبشار'' کے نام ایک ہفت روزہ کا ڈکلیریشن بھی حاصل ہوگیا۔ جیسے تیسے کرکے ایک شمارہ بھی شائع ہوا؛ مگر پہلا شمارہ مع ڈکلیریشن ضبط ہوگیا؛ کیوں کہ حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے رفیوجیوں کے حال زار پر تبصرہ میں بہت احتیاط کے باوجود ایک ایسی بات آگئی، جس سے دوقومی نظریہ کی مذمت ظاہر ہوئی تھی۔''

لاہور کی بے کاری، بے روزگاری اور نامساعد حالات سے دل برداشتہ شینؔ مظفرپوری خلیق دہلوی کے بلاوے پر جون ۱۹۴۸ء میں کراچی منتقل ہوگئے، جہاں ایک رسالہ کے مدیر کی حیثیت سے ملازمت کی صورت نکل آئی تھی۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخبار ورسائل میں ماہنامہ 'رومان' اور روزنامہ 'جنگ'

کے علاوہ اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'مضراب' کی مفصل روداد انہوں نے قلم بند کی ہے، حالانکہ مضراب کا صرف تین شمارہ ان کی ادارت میں منظر عام پر آیا؛ مگر 'نقوش'، 'سویرا' اور 'ادب لطیف' جیسے اہم ترقی پسند رسالوں کی اشاعت پر ان دنوں لگی پابندی سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے 'مضراب' نے پر کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ ادبی حلقوں میں 'مضراب' کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ شینؔ لکھتے ہیں:

''ان لوگوں (یعنی 'مضراب' کے مالکان) نے تو 'مضراب' کو ایک فلمی میگزین کے طور پر نکالنے کا فیصلہ کر رکھا تھا؛ مگر ایک اچھا معیاری فلمی رسالہ نکالنے کے بھی خاطر خواہ وسائل ان کے پاس نہیں تھے۔ تب میں ان کو نشیب وفراز سمجھا کر اور بہتر امکانات کا یقین دلا کر راستے پر لایا اور 'مضراب' کو ایک ''ترقی پسند'' جریدہ کے طور پر جاری کرنے کی پالیسی طے ہوگئی اور چونسٹھ صفحات پر مشتمل اس کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ دوسرا شمارہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں اور تیسرا شمارہ دسمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میں ہندوستان واپس آگیا۔ ('مضراب' کے ابتدائی تین شمارے خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ذخیرے میں موجود ہیں)۔''

'رقصِ بسمل' کا مطالعہ ہمیں شینؔ مظفرپوری کے ادبی فتوحات، تخلیقی سرگرمیوں اور صحافتی زندگی جو ان کا ذریعہ معاش تھا، سے بھی آگاہ کراتا ہے، مثلاً ان کا ایک طویل افسانہ جو ساتھی (دہلی) میں شائع ہوا تھا، اسے وسعت دے کر شینؔ نے ناول کی شکل دے دی جو لاہور سے 'فرحت' کے عنوان سے شائع ہوا اور بعد میں اسے مزید توسیع کے ساتھ ''کھوٹا سکہ'' کے عنوان سے کتابی شکل دی گئی۔ بقول شینؔ مظفرپوری:

''یہ ناول ۱۹۵۸ء میں کلکتہ کے ایک روزنامہ اخبار ''اخوت'' میں (جس میں میں ملازم تھا) قسطوں میں شائع بھی ہوا۔ بعد ازاں پٹنہ کے رسالہ ماہنامہ ''صنم'' نے (اس میں بھی ملازم تھا) ۱۹۶۱ء میں اس کو کتابی شکل میں شائع کردیا، جو میرا ایک اہم ادبی کارنامہ قرار پایا۔ زیب داستان کی باتوں اور ماجرا سازی کے لوازمات سے قطع نظر، مجھے قریب سے جاننے والوں نے اس کو میری ۱۹۵۷ء تک کی زندگی کا افسانہ ہی جانا، یہ ناول خود مجھے بہت عزیز ہے۔''

اسی طرح اپنے ناول 'ہزار راتیں' کی انفرادیت اور تقسیم ہند کے تعلق سے لکھے گئے افسانہ ''دستک'' کی بے پناہ مقبولیت کے قصے قاری کے معلومات میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور شینؔ کی فنی عظمت کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ ادب اور صحافت شینؔ کا Passion بھی تھا اور پیشہ بھی۔ تمام عمر وہ ان

دونوں کے درمیان توازن بنانے کی سعی کرتے رہے؛ مگر توازن تھا کہ بنتا اور بگڑتا رہا۔ لیلائے روزگار نے اکثر بسیار نویسی پر مجبور کیا؛ لیکن موقع ملتے ہی سنبھلتے بھی رہے، البتہ یہ قلق زندگی کے آخری ایام تک رہا کہ زمانے نے ہمیشہ ان کا استحصال کیا۔ 'رقصِ بسمل' میں اس کرب کا اظہار یوں ہوا ہے:

"میرے کراچی پہنچتے ہی 'مضراب' کی اشاعتی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ یہ ڈیڑھ سو والی رقم کلکتہ، دلی اور لاہور سے میرا پیچھا کرتی آرہی تھی اور عجب اتفاق کہ کراچی کے بعد بھی وہ کلکتہ سے پٹنہ ۱۹۶۶ء تک میرا پیچھا کرتی رہی۔ اس کے بعد ہی اس نحوست نے جان چھوڑی اور بھاؤ بڑھنا شروع ہوا اور وہ بھی کیا! بس دل کو بہلانے تک۔ اس معاملے میں ساری زندگی میرا بے رحمانہ استحصال ہوا ہے۔ نوکری کے علاوہ کتابوں کے معاملے میں بھی۔ فی الحال جولائی ۱۹۹۳ء سب سے بڑی اور عبرت انگیز بلکہ دردناک اور ان شاء اللہ آخری مثال بہار اردو اکادمی، پٹنہ کی ہے جس کے 'زبان وادب' کا میں ایڈیٹر ہوں۔ اٹھارہ سو روپے ماہنامہ تنخواہ پر! جہاں کلرکوں کو اس سے دوگنی تنخواہ ملتی ہے! بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست! بات نکل آئی ہے تو بطور ریکارڈ واضح رہے کہ زندگی میں میری سب سے زیادہ تحقیر، توہین اور حق تلفی، تینوں ساتھ ساتھ، بہار اردو اکادمی، پٹنہ میں ہوئی۔ بلکہ برسوں ہوتی رہی۔"

یہ ڈیڑھ سو کا قصہ بھی نہایت دلچسپ اور عبرت ناک ہے کہ ہمارا سماجی تانا بانا کچھ اس طور سے بنا گیا ہے کہ جہاں عالمِ فاقے اور جاہل میوے کھاتے ہیں۔ شین کی زبانی یہ روداد سنئے:

یہ ڈیڑھ سو کا عدد اکثر میرے پیچھے لگا رہا ہے بطور ماسبق میں تنخواہ کے تعلق سے اس کا ذکر آچکا ہے۔ اب کتابوں کی رائلٹی کی باری ہے۔ 'فرحت' کے لیے دہلی میں بھی زیدی صاحب ڈیڑھ سو روپے دے چکے تھے۔ میری پہلی کتاب "آوارہ گرد کے خطوط" کے لیے بھی ڈیڑھ سو روپے ملے بعد ازاں "کڑوے گھونٹ" کے لیے شمع بکڈپو، دہلی نے اور "دکھتی رگیں" کے لیے 'بیسویں صدی' لاہور نے بھی ڈیڑھ ڈیڑھ روپے دیے تھے، پھر ۱۹۵۷ء میں فرحت کا توسیعی روپ "کھوٹا سکہ" (ناول) جب کلکتہ کے روزنامہ 'اخوت' میں قسط وار شائع ہوا تو اس سے بھی ڈیڑھ سو ہی ملے۔ مزید برآں اس ناول کو جب صنم بک ڈپو، پٹنہ نے شائع کیا (۱۹۶۱ء) تو اس نے بھی ایک ایڈیشن کی رائلٹی ڈیڑھ سو ہی دی۔

میرے ناولٹ "تین لڑکیاں ایک کہانی" کے ایک ایڈیشن کے لئے (۱۹۵۹ء) کتاب منزل، پٹنہ نے ڈیڑھ سو ہی دیے۔ مکتبہ نئی زندگی، دہلی نے بھی ۱۹۶۶ء میں میرے ایک افسانوی مجموعہ "دوسری بدنامی" کے ایک ایڈیشن کی رائلٹی ڈیڑھ سو روپے ہی ادا کی۔"

'رقصِ بسمل' اپنی جزئیات نگاری، منظرکشی، اسلوب اور پیش کش کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک نادر تخلیقی فن پارے کا درجہ رکھتی ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شین کی کہانیاں جزئیات نگاری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ میرے نزدیک اردو افسانے میں جزئیات نگاری کے حوالے سے ان کے ہم پلہ کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شین کی پرکشش زبان جس میں علاقائی الفاظ کی چاشنی اور محاوروں کی مرصع سازی انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز و منفرد بناتی ہے۔ یہیں یہ عرض کرتا چلوں کہ جنس نگاری کا الزام عائد کر کے شین کی کہانیوں کو جس طرح نظر انداز کیا گیا، وہ ان کے فن کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ شین نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے مسائل، ان کے استحصال، ان کی بے بسی، ان کی بہادری، ان کے جدوجہد اور ان کی نفسیات کی جو Multi Dimentional تصویر کشی کی ہے، وہ اردو کے کم افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہے۔ رقص بسمل کے صفحات تانیثیت کے ان گراں مایہ افکار سے مزین ہیں۔ ضرورت اس نہج پر مطالعے کی ہے۔ چلتے چلتے شین کے مزاحیہ حس سے آپ کو آشنا کرتا چلوں، جو ان کی جبلت کا حصہ تھی۔ خلیق دہلوی کی نسبت سے 'رقصِ بسمل' کے ان جملوں سے آپ یقیناً محظوظ ہوں گے:

"پرانا کیمپ (دہلی) سے روانہ ہونے والے ہمارے قافلے میں ناقص آنکھوں کی تعداد خاصی تھی۔ مرد، عورت اور بچہ، سو ان میں ایک میرے یار میاں خلو کی آنکھیں بھی "عین غین" تھیں۔ ویسے تو ایک عوامی کہاوت ہے کہ سو میں سور ہزار میں کانا سوا لاکھ میں اینچا تانا، والی کوئی خصوصیت خلو میں نہیں پائی جاتی تھی۔"

اس پوری گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شین مظفرپوری کی تصنیفات میں "رقص بسمل" کو امتیازی شان یوں حاصل ہے کہ یہ شین کی شخصیت، ان کے فن اور ان کے شب و روز کا احاطہ ہی نہیں کرتی ہے؛ بلکہ اس کی اہمیت اس طور سے اور بھی گراں ہو جاتی ہے کہ یہ معلومات کا وہ انمول خزینہ ہے، جو آنے والی نسلوں کو نہ صرف شین سے متعارف کرائے گی؛ بلکہ ان کے عہد اور معاصرین کے ادبی سروکار سے واقفیت کا ذریعہ بھی بنے گی۔ دوسرے لفظوں میں 'رقصِ بسمل' کی دستاویزی حیثیت مسلم ہے۔

صحافت نگاری

صحافت شین مظفر پوری کا پہلا اور آخری Passion تھا۔ حالانکہ اس پیشے سے وابستہ ہو کر شین، روتے بھی رہے، ہنستے بھی رہے۔ اپنے اس پیشے پر انہیں ناز بھی تھا اور عمر بھر اس کے شاکی بھی رہے۔ دراصل کوئی اور ملازمت اُن کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ لہذا ''مرقع'' (۱۹۴۰ء) کلکتہ اور ماہنامہ ''ہمالہ'' (۱۹۴۱ء) دربھنگہ کی اعزازی ادارت سے صحافتی سفر کا جو آغاز انہوں نے کیا تھا، ۱۹۴۵ء میں کلکتہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار ''نقاش'' سے وابستگی کے ساتھ یہ باضابطہ ان کا پیشہ ٹھہرا۔ شین کے مطابق:

> ''ہوتے ہوتے اگست ۱۹۴۵ء میں کلکتہ کے ہفتہ وار 'نقاش' میں کام کرنا شروع کر کے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ یہ گویا ایک سانحہ ہی تھا۔'' ('رقصِ بسمل')

آخری پڑاؤ تک شین مظفر پوری اس سانحے کی زد میں رہے؛ یعنی صحافت ہی ان کا ذریعہ معاش رہا۔ 'نقاش' میں کام کرتے ہوئے شین نے صحافت کے میدان میں کچھ ایسے نقش چھوڑے کہ ان کی شہرت دلی اور لاہور تک پہنچ گئی۔ دہلی اس وقت نیم ادبی اور فلمی رسالوں کا مرکز تھی، ادبی رسالے برائے نام شائع ہو رہے تھے۔ اول الذکر رسالوں میں 'شمع'، 'کہکشاں'، 'فلم لائٹ' اور 'آرٹسٹ' وغیرہ کی دھوم تھی۔ ان رسالوں میں معاصرانہ چشمک اور پیشہ ورانہ رقابت بھی عروج پہ تھی۔ ایسے میں 'آرٹسٹ' کے مالک جناب خلیق دہلوی کی دعوت پر شین ۱۹۴۶ء کے اوائل میں دہلی آ

گئے۔ چند مہینوں تک 'آرٹسٹ' کی ادارت سے وابستہ رہنے کے بعد 'فلم لائٹ' والوں نے بقول شین 'ان کو اچک لیا'۔ ان فلمی رسالوں کی ادارت کے علاوہ شین کا کام ان رسالوں میں اس وقت کی ہیروئن مثلاً مینا کماری، ثریا اور گیتا بالی وغیرہ کے نام سے چھپنے والی کہانیوں کی تخلیق کرنا بھی تھا۔ گویا فرضی ناموں سے کہانیاں لکھنا اور پیسے کمانا شین کا مشغلہ بن گیا تھا۔ دہلی کے تقریباً ڈیڑھ سال کے اس قیام میں شین مظفر پوری بطور افسانہ نگار اور بطور صحافی خاصا مشہور ہو گئے اور ان کی شہرت ملک گیر ہو گئی۔ اسی اثنا تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور پورا ملک فساد اور قتل و غارت گری کی زد میں آ گیا۔ شین کو اپنی جان بچانے کے لیے پاکستان کا رُخ کرنا پڑا، جہاں لاہور میں تقریباً دس ماہ اور کراچی میں لگ بھگ چھ ماہ ان کا قیام رہا۔ ان دونوں جگہوں پر شین کا نام، ان کے تعلقات اور ان کا حلقۂ احباب ان کے کام آیا۔ صحافت نگاری یہاں بھی ذریعہ معاش بنی۔ لاہور میں اپنے پرانے رفیق خان عیسیٰ غزنوی اور رفیق چمن کے ذریعہ جاری کئے گئے اخبار ''مسلم'' اور ''نور جہاں'' کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی؛ مگر چند ہفتوں میں ہی یہ اخبارات بند ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے پرانے شناسا الٰہی بخش نے ''آبشار'' کے نام سے ایک ہفتہ وار شین مظفر پوری کی ادارت میں شروع کیا؛ مگر اس کا صرف ایک شمارہ ہی نکل سکا اور اخبار پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کی وجہ شین مظفر پوری کا تحریر کردہ وہ مضمون تھا، جس میں رفیوجیوں کی ناگفتہ بہ حالت پر سخت تنقید کی گئی تھی اور اشارتاً دو قومی نظریے کی مخالفت کی گئی تھی۔ ظاہر ہے شین کے قلم میں جو دھار تھی، اس نے نشتر زنی کی اور اخبار بند ہو گیا۔

چند ماہ کے بعد شین مظفر پوری خلیق دہلوی کے بلاوے پر کراچی آ گئے۔ یہاں ''جنگ'' کے دفتر سے ملحق ایک کمرے میں مقیم ہوئے۔ یہ کمرہ بیک وقت ان کی رہائش گاہ بھی تھا اور ان کی ادارت میں شائع ہونے کو منتظر رسالہ ''مضراب'' کا دفتر بھی تھا۔ دراصل خلیق دہلوی 'مضراب' کو ایک فلمی میگزین کے بطور نکالنا چاہتے تھے؛ مگر شین نے ان کو اسے بطور ترقی پسند ادبی رسالہ کے نکالنے کا مشورہ دیا؛ بلکہ آمادہ بھی کر لیا۔ 'مضراب' کا پہلا شمارہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اگست ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا۔ دیکھتے دیکھتے پورے پاکستان میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کے تین شمارے ہی شین کی ادارت میں نکلے تھے کہ شین نے وطن واپسی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ 'مضراب' کے تیسرے شمارے میں 'اطلاع نامہ' شائع کر کے انہوں نے رسالہ اور پاکستان دونوں کو خیر باد کہنے کا اعلان کر دیا۔ ''باحسرت ویاس!'' کے عنوان سے شائع اس اعلان کے الفاظ یوں ہیں:

''میں اپنی ذاتی مجبوریوں کے تحت 'مضراب' سے علاحدہ ہوکر ہمیشہ کے لیے ہندوستان واپس جارہا ہوں۔ میرے خاندان نے ہندوستان سے ہجرت نہیں کی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں پاکستان میں ادبی اور معاشی سرگرمیاں بدستور جاری رکھ سکوں گا؛ لیکن آمد ورفت کی روز بروز بڑھتی مشکلات نے ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا ہے۔ 'مضراب' بدستور نکلتا رہے گا اور جیسا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کی پالیسی میں بھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ مجھے توقع ہے کہ قلمی معاونین حسب سابق 'مضراب' سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔ اس شمارے کے بعد 'مضراب' قمر ہاشمی کی ادارت میں شائع ہوگا۔ قمر ہاشمی ذہین، ہونہار شاعر وادیب ہیں اور 'مضراب' ان کی ادارت میں بہتر سے بہتر شائع ہوسکے گا۔'' ('مضراب'، شمارہ ۳، دسمبر ۱۹۴۸ء)

'مضراب' کے تینوں شمارے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان شماروں کے مشتملات پر نگاہ ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی سربرآوردہ شخصیتوں کی تخلیقات سے 'مضراب' کے تینوں شمارے مزین ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی، کرشن چندر، اخترؔ ہوشیارپوری، آوارہ، نازشؔ پرتاپ گڑھی، احمد راہی، مجتبیٰ حسین، اسعد گیلانی، احمد ندیم قاسمی، نریش کمار شادؔ، اثرؔ لکھنوی، سیف الدین سیفؔ، عبدالحمید عدمؔ، قتیلؔ شفائی، عزیز اثری اور شیخ ایاز وغیرہ کا قلمی تعاون جہاں 'مضراب' کی مقبولیت کو درشاتا ہے، وہیں شین کی مقناطیسی شخصیت اور مدیرانہ صلاحیت کا بھی بیّن ثبوت ہے۔

مضراب کے اگست، ستمبر اور دسمبر ۱۹۴۸ء کے ان شماروں میں ''ذکر وفکر'' کے عنوان سے اداریے لکھے گئے ہیں۔ اگست کے شمارے میں ایڈیٹر کے طور پر شین مظفرپوری کے ساتھ خلیق دہلوی کا نام درج ہے۔ بعد کے دو شماروں میں صرف شین مظفرپوری کا نام بطور مدیر شائع ہوا ہے۔ اگست کا شمارہ جو شین کی ادارت میں پہلا شمارہ تھا کو ایسا لگتا ہے کہ توقع سے کم قلمی تعاون حاصل ہوسکا ہے؛ کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو صرف اسی شمارے میں شین نے مختلف ناموں سے (فرضی ناموں) اپنی تحریریں شامل کی ہیں۔ ''ایک اجنبی لاہور میں'' کے عنوان سے خود اپنی ایک طویل کہانی کے علاوہ ورشم کے نام سے بعنوان ''میری خاموشیاں''، بلقیس فاطمہ کے نام سے کہانی ''میل جول'' شامل ہیں۔ یہ بلقیس فاطمہ شین کے ذہن کی پیدا شدہ فرضی ادیبہ ہیں، جن کے نام سے شین خود اپنی تحریریں شائع کرتے رہے تھے۔ ان کے علاوہ اس شمارے میں ولی الرحمٰن کے نام سے ایک تخلیق ''ذلیل ہندوستانی'' بھی شائع ہوئی ہے اور شمارے کا آخری مضمون فرشتۂ رحمت، خلیق کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے

کہ یہ دونوں تخلیقات بھی شین کے قلم کی مرہون منت ہیں؛ کیوں کہ شین کا اصل نام ولی الرحمٰن ہے، جب کہ خلیق دراصل خلیق دہلوی ہیں، جو رسالہ کے مالک کا نام ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ خلیق خود سے دو جملے بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ قرین از قیاس ہے کہ اسی شمارے میں ثریا بانو کے نام سے جو کہانی ''ٹھنڈا پسینہ'' اشاعت پذیر ہوئی ہے، وہ فلمی ہیروئن ثریا کے نام سے شین نے لکھی ہے۔ گویا ایک شمارے میں پانچ تخلیقات شین مظفرپوری کی اپنی تحریر ہے۔ اس سے شین مظفرپوری کے زورِ قلم، زودنویسی اور صحافتی مشاقی کا پتہ چلتا ہے۔ اس شمارہ کو ترقی پسند تحریک کے ترجمان کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور ترقی پسند ادبا وشعرا سے قلمی تعاون اور رسالے سے جڑنے کی اپیل کی گئی ہے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء کے شمارے میں ایم. امام کے نام سے مشہور شاعر مظہر امام کی نظم ''ایک ترتیب'' شامل ہے۔ اس زمانے میں مظہر امام اسی نام سے لکھتے تھے۔ خود شین کا ایک افسانہ ''کٹی ہوئی پتنگ'' کے عنوان سے اس شمارے میں شامل ہے۔ یہ دراصل ان کے ناول ''کھوٹا سکّہ'' کا ایک باب ہے، جو ان دنوں تخلیق کے مرحلے میں تھا۔ اس شمارے سے ''کھرے کھوٹے'' کے عنوان سے معاصر رسالوں اور اخباروں پر تبصرے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ تبصرے شین نے ورشم کے نام سے خود کئے ہیں۔ اس شمارے میں ماہنامہ 'نیا ادب' بمبئی، ماہنامہ 'حرم' لاہور، ماہنامہ 'فروزاں' لاہور اور ہفت روزہ 'سوشلسٹ' کراچی پر تعارفی تبصرے موجود ہیں۔ اس شمارے میں اقبال احمد صدیقی کی کتاب ''ہندوستان سے پاکستان تک'' کا وہ اشتہار بھی موجود ہے، جس کے بارے میں 'رقصِ بسمل' میں شین مظفرپوری نے لکھا ہے کہ ان کا افسانہ ''کنواری مریم'' اسی کتاب میں شامل ہے۔

'مضراب' کے دسمبر ۱۹۴۸ء کے شمارے (شین کی ادارت میں آخری شمارہ) میں شین نے اس رسالے کی ادارت کو خیرباد کہنے اور اپنے وطن (ہندوستان) واپس لوٹنے کا اعلان کیا ہے، جس کا ذکر قبل میں آچکا ہے؛ لیکن شمارے میں شامل شین کا وہ خط جو ''احمد ندیم قاسمی کے نام'' کے عنوان سے اداریہ کے فوراً بعد چھپا ہے، وہ تہلکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط سے اختلاف، یا اتفاق اپنی جگہ، منٹو کے ادبی مستقبل کے سلسلے میں شین کی پیشن گوئی اپنی جگہ؛ مگر جس بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ منٹو اور حسن عسکری پر شین حملہ آور ہوئے ہیں؛ بلکہ ان کی خبر لی ہے، وہ شین کے 'آہنی جگراں' کا آئینہ دار ہے۔ اس مضمون نما خط کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ یہ اپنے عہد کے ادبی مزاج اور نظریاتی اختلافات کو آشکار کرنے کے ساتھ ساتھ شین کے اندازِ فکر ونظر کا

مظہر بھی ہے۔(مذکورہ بالا خط اس مونوگراف میں شامل ہے)

جنوری ۱۹۴۹ء میں وطن واپسی کے بعد از سرِ نو معاشی مسئلہ سر اٹھائے کھڑا تھا۔آزاد ہندوستان میں شین مظفر پوری نے اپنی دوسری پاری کا آغاز کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار 'کارواں' سے کیا۔یہ اخبار ایک ایوننگ اخبار تھا اور محمد یونس نظری اس کے مالک و مدیر تھے؛ مگر پس پردہ ادارت کی ساری ذمہ داری شین کے کندھوں پر تھی۔اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شین کے آنے کے بعد یہ اخبار اکثر بلیک میں بکتا تھا۔بنگال کے علاوہ بہار میں بھی اس کے قارئین کی خاصی تعداد موجود تھی۔اس زمانے میں شین وقت نکال کر کلکتہ سے ہی شائع ہونے والے روزنامہ ''انگارہ'' کے لیے بھی اداریے لکھنے اور خبریں ترتیب دینے کا کام بھی کرتے رہے تھے۔اس سے صحافت پر شین مظفر پوری کی گرفت اور ان کی محنت و مشقت کا پتا چلتا ہے۔کچھ دنوں کے بعد ان دونوں اخبارات سے شین نے علاحدگی اختیار کر لی اور ''عصر جدید'' سے وابستہ ہو گئے۔یہاں پہلے نیوز ایڈیٹر اور بعد میں ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔یہ اخبار حکومت نواز تھا؛ بلکہ حکومت کی آواز بن گیا تھا، جو شین مظفر پوری کے مزاج کے برعکس تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی استعفیٰ دے کر اپریل ۱۹۵۱ء میں 'روزنامہ ہند' سے وابستہ ہو گئے۔یہ دور شین کی صحافت کا شگفتہ دور تھا۔ابراہیم ہوشؔ اور بسنت کمار چٹر جی کی ہم نشینی نے اسے دو آتشہ کر دیا تھا۔ایک بے باکی اور آزاد روی جو مدت سے شین کے اندر پروان چڑھ رہی تھی، تکمیلیت کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔اس اخبار میں خبروں کی ترتیب کے علاوہ شین ایک فکاہیہ کالم 'کہنے کی باتیں' کے عنوان سے لکھتے تھے جو عوام میں بے حد مقبول تھا۔ مارچ ۱۹۵۴ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا اس کے بعد شین نے اس اخبار کو الوداع کہہ دیا۔

اگست ۱۹۵۷ء میں کلکتہ سے ''اخوت'' کا اجرا ہوا تو پروفیسر وہاب اشرفی کے مشورے پر ''اخوت'' کے مالک اکبر ماجد 'بکی' نے شین مظفر پوری کو اخبار سے وابستہ ہونے کی دعوت دی، جو ان دنوں بمبئی کی فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔شین نے یہ آفر قبول کر لیا اور 'اخوت' سے وابستہ ہو گئے، جہاں وہاب اشرفی بطور مترجم کام کر رہے تھے۔شین سے وہاب کی قربت اسی زمانے کی دین ہے۔شین مظفر پوری سے اپنے گہرے اور دیرینہ تعلقات کا ذکر پروفیسر وہاب اشرفی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میرے ان (شین مظفر پوری) سے دیرینہ تعلقات تھے۔کلکتہ میں جب دوستوں کی مدد سے روزنامہ ''اخوت'' (مدیر ناظر الحسینی) نکالا گیا تو نہ معلوم کیوں مجھے شین

> مظفر پوری نظر آئے۔وہ اس وقت بمبئی میں تھے۔میں اکبر ماجد ''بکی'' کو جو اس اخبار کے مالک تھے، شین صاحب کی انشا پردازی اور صحافتی تجربے کا حال بتایا تو انہوں نے فوراً ان کو دعوت بھیج دی۔وہ کلکتہ چلے آئے اور ''اخوت'' سے وابستہ ہو گئے۔میں کچھ دن کے بعد جب پٹنہ آیا تو ''صنم'' کا اجرا کیا۔اب تک اس کے پچاس شمارے نکل چکے تھے۔میرا تبادلہ جب گیا ہونے لگا تو میں نے خود شین مظفر پوری کو دعوت دی کہ وہ ''صنم'' کی باگ ڈور سنبھالیں۔موصوف میری دعوت پر پٹنہ آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے جب شین مظفر پوری، وہاب اشرفی کی دعوت پر پٹنہ آ گئے اور ''صنم'' کی ادارت سے منسلک ہو گئے۔۱۹۴۱ء سے صحافت کی راہ کا یہ مسافر اب ایک ماہر، تجربہ کار اور نامور صحافی بن چکا تھا؛ مگر ابھی تک یہ دوسروں کے اخبار میں بطور ملازم کام کرتا رہا تھا۔اپنا اخبار نکالنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔پٹنہ آنے کے بعد شین نے ایک ایسے اخبار کی شدت سے ضرورت محسوس کی جو عوام کا ترجمان ہو۔بعض رفقا نے بھی حوصلہ بڑھایا۔بالآخر ۱۹۵۹ء میں شین مظفر پوری نے ''ہمارا بہار'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا۔یہ شین کا اپنا اخبار تھا یعنی پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر سے لے کر ڈسپیچر تک خود شین مظفر پوری تھے۔اس کے پہلے شمارے نے ہی دھوم مچا دی۔ہمارا بہار کے اجرا پر ہفتہ وار ''سنگم'' کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> ''ہمارا بہار کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔''ہمارا بہار'' کے ایڈیٹر مشہور صحافی، اردو کے مقبول افسانہ نگار شین مظفر پوری ہیں۔وہی پرنٹر اور پبلیشر بھی ہیں اور غالباً مالک بھی۔پہلے صفحے پر اڈیٹوریل ہے جس کا بولتا ہوا عنوان ''سیتا کی دھرتی پر راون کا ناچ'' یہ بتا رہا ہے کہ شین جیسے تجربہ کار صحافی نے کس موضوع پر اور کس ڈھب سے قلم اٹھایا ہے۔ہمارا بہار ـــــ بہار کی نحیف، کمزور اور ضعیف صحافتی دنیا میں ایک مضبوط، مستحکم اور روادار آواز کی پیشن گوئی کر رہا ہے۔جہاں ہمارے صحافی اقتدار کے حصول کی خواہش نائب وزارت اور وزارت کی تمنا دل میں لے کر صحافت، زبان اور قوم کا سودا اپنے اخباروں کے ذریعہ کر رہے ہیں وہاں ریاست میں کسی ایسی صدا کا اٹھنا قابل صد تحسین آفریں ہے جو آزادی، بے باکی اور جرأت کا پیغام دیتی ہو۔'ہمارا بہار' ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔'' (ہفتہ وار ''سنگم'' جولائی ۱۹۵۹ء)

یہ تبصرہ دو معنوں میں نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ پہلا ان معنوں میں کہ غلام سرور جیسی صحافت کی عبقری شخصیت کی ادارت میں شائع ہونے والے ''سنگم'' نے واضح الفاظ میں شین کی صحافتی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ''سنگم'' ہی کیا اس اخبار کا خیر مقدم عظیم آباد کے علمی و ادبی حلقے کے علاوہ ملک گیر پیمانے پر ہوا۔ کئی اہم رسالوں اور اخباروں نے اس کی کھل کر تعریف کی۔ ان سب سے بڑھ کر عوام نے جس طرح ''ہمارا بہار'' کو گلے لگایا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو تین ہفتوں کے بعد ہی اس کی تعداد اشاعت پانچ ہزار سے تجاوز کر گئی۔ دوسرا ان معنوں میں کہ اُس زمانے میں صحافت اور ادب میں اعلیٰ اقدار اور فراخ دلی کے عناصر پوری زندگی کے ساتھ موجود تھے۔ وہی زمانہ تھا کہ ایک اخبار کے اجرا پر دوسرے اخبار نے فراخ دلی کے ساتھ حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا۔ ورنہ آج تو رقابت اور حسد کا یہ عالم ہے کہ کسی اخبار کے اجرا کی خبر دوسرا اخبار شائع بھی نہیں کرتا، تعریف تو دور کی بات ہے۔

''ہمارا بہار'' کی اپنی ایک پالیسی تھی اور وہ شین کے فکر و عمل کا پرتو تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کا ہمیشہ اس بات پر زور رہا کہ اخبار کو مدیر کی شخصیت کا عکاس ہونا چاہیے۔ ''ہمارا بہار'' کے کسی بھی شمارے کو اٹھا لیجئے، شین کی ذات و صفات کا عکس پوری طرح جلوہ فگن نظر آئے گا۔ دراصل صحافت شین کے نزدیک ایک عبادت، ایک مشن کا درجہ رکھتی تھی۔ ''ہمارا بہار'' میں تحریر کردہ یہ سطور اس کا ثبوت ہیں:

> ''ہمارا بہار کے اجرا میں اپنا ذوق و شوق، کسب معاش اور خدمت عوام کا جذبہ تینوں کار فرما ہے۔ یہی صاف اور سچی بات ہے۔ قوم کی جو خدمت میں سراسر تجارتی، مصلحت پسند اور سرکار کے چشم آبرو کو دیکھ دیکھ کر چلنے والے اخبار میں ملازمت کر کے نہیں کر سکتا وہ اپنا آزاد خیال اور غیر جانب دار پرچہ شائع کر کے انجام دینا چاہتا ہوں۔''

('ہمارا بہار'، ۱۲۵ اگست ۱۹۵۹ء)

بے خوف، بے باک اور غیر جانب دارانہ عقیدے پر استوار ''ہمارا بہار'' کا پہلا شمارہ ان معنوں میں دھماکہ خیز تھا کہ اس کا اداریہ بعنوان ''سیتا کی دھرتی پہ راون کا ناچ'' احتجاج کی وہ آواز تھی، جس نے ایوانِ حکومت میں لرزہ طاری کر دیا۔ اداریہ کا منتخب حصہ آپ کی نذر ہے:

> ''ابھی سیتا مڑھی اور آختہ کے شہیدوں کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ درندگی اور بربریت کی لکھی جانے والی داستان کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے، اس دھرتی پر بہنے

> والے بے گناہوں کے لہو دھبے بھی نہیں مٹے ہیں۔ گھائل ہونے والوں کی کراہوں اور بیوہ اور یتیم ہونے والوں کی آہوں کی گونج بھی فضا میں موجود ہے۔ دل ویسے ہی زخمی ہیں۔ جذبات ویسے ہی گھائل ہیں۔ پنچ شیل کی دھرتی کی گردن ابھی ندامت سے جھکی ہی ہوئی ہے۔ ہمارے اہنسا وادی نیتاؤں نے ہمارے دل کے گہرے گھاؤ پر جو مرہم رکھا ہے، ابھی اس نے اپنا اثر نہیں دکھایا ہے۔
>
> مگر سیتا کی دھرتی کے راونوں نے اپنا ننگا شیطانی ناچ پھر شروع کر دیا۔ انسانی لہو سے ابھی راونوں کی درندگی کی پیاس بجھی نہیں ہے راون کا شیطانی منصوبہ سیتا مڑھی اور آختہ کی طرح دھرتی کے چپہ چپہ کو بے گناہوں اور کمزوروں کے خون سے لالہ زار بنانے کے لیے بے قرار ہے۔ انسانیت کے لہو سے اس کا دامن داغ داغ ہے۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے ہیں۔ آستین سے لہو ٹپک رہا ہے مگر اہنسا، جمہوریت اور سیکولرزم کی ساری طاقتیں اس راون کو قابو میں کرنے سے قاصر ہیں''

('ہمارا بہار'، ۲۵ر جون ۱۹۵۹ء)

یہ اداریہ دراصل ۱۹۵۹ء میں ہوئے سیتا مڑھی فساد کے بعد اس وقت لکھا گیا تھا جب بظاہر فساد کی آگ بجھ چکی تھی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ 'گرم راکھ' کے اندر دبی چنگاریوں کو ایک سازش کے تحت ہوا دی جا رہی تھی؛ تاکہ سارے چمن کو جھلسایا جا سکے۔ اس سازش میں سیاست داں سے لے کر نوکر شاہ تک اور سماج کے ٹھیکہ داروں سے لے کر فرقہ وارانہ و تشدد پسند ذہنیت رکھنے والے افراد شامل تھے۔ شین نے حالات کی نزاکت کو نہ صرف محسوس کیا؛ بلکہ حقیقت حال سے حکومت کو جس سلیقے سے آگاہ کیا، وہ قابل داد ہے۔ صحافت کا یہ انداز جس میں کسی کو خبر دی گئی تو کسی کی خبر لی گئی، یہ صرف اور صرف شین سے مختص ہے۔

مواد اور پیش کش کے لحاظ سے ''ہمارا بہار'' کو ایک مکمل اور منفرد اخبار کہا جا سکتا ہے۔ یہاں دیس بدیس کی خبریں موجود ہیں تو حالات حاضرہ پر دوٹوک اور جرأت مندانہ تبصرے بھی خوب ہیں، جہاں تفریح و تفنن کے سامان رکھے گئے ہیں، وہیں طنز و مزاح سے بھرپور کالم کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ شین کی تحریریں اپنے ظریفانہ و طنزیہ لب و لہجہ کے لیے مشہور رہی ہیں، لہٰذا ''سرد و گرم'' کے عنوان سے اپنے مستقل کالم میں انہوں نے طنز و مزاح کی آڑ میں سماجی و سیاسی بدکاریوں کی جو نشتر زنی کی

ہے، وہ قابل دید ہیں۔تازہ ترین واقعات پر مبنی ’ہمارا بہار‘ کے کارٹون اتنے پُر اثر، با معنی اور زندہ ہوتے تھے کہ آج بھی قارئین ان سے حظ اٹھالیں۔شین کو سرخیاں لگانے میں مہارت حاصل تھی۔ ہمارا بہار میں خبروں کی سرخیاں ہوں، یا اداریوں کی سرخیاں، کارٹون کی سرخیاں ہوں، یا مضامین کی سرخیاں، ہمیشہ ندرت اور تازگی کا احساس کراتی ہیں، چبھتا ہوا شوخ اور سٹیک۔شین نے اپنی اس مہارت کا استعمال اکثر اپنے افسانوں کا عنوان منتخب کرنے میں بھی کیا ہے، جس کا تفصیلی ذکر میں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔

’’ہمارا بہار‘‘ جس آن بان اور جوش وخروش کے ساتھ نکلا، قلیل عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ وجہ ’مالی دشواری‘۔اس خدشے کا اظہار شین اخبار کے ابتدائی شماروں میں کر چکے تھے:

’’اگر آپ نے (قارئین/عوام) میرے ساتھ تعاون نہیں کیا اور محض زبانی واہ واہ سے مزاجی خوش کرتے رہے تو ’ہمارا بہار‘ نہیں چل سکے گا۔مالی دشواریوں کی وجہ سے میرے قدم ڈگمگا جائیں گے اور آپ ایک اچھا اخبار پڑھنے سے محروم ہو جائیں گے۔‘‘

شین نے دوبارا ہمت کی اور ’’ہمارا بہار‘‘ کو عوامی مطالبے کے پیشِ نظر جاری کیا؛ مگر اس کہاوت کے مصداق کہ ’بکری کی ماں کب تک خیر مناتی‘ ۱۹۶۲ء کے اواخر میں شین مظفر پوری کو ’’ہمارا بہار‘‘ کو نہ چاہتے ہوئے بھی بند کر دینا پڑا۔بعد میں شین صاحب نے اس اخبار کو پروفیسر اسلم آزاد کے ہاتھوں فرخت کر دیا، جسے ایک عرصے تک انہوں نے روزنامہ کی شکل میں نکالا۔

’’ہمارا بہار‘‘ کے بند ہو جانے کے بعد شین مظفر پوری تقریباً پانچ برسوں تک مختلف اخباروں میں بطور صحافی کام کرتے رہے۔ان اخبارات میں ’’ملک وملت‘‘(دہلی) اہمیت کا حامل ہے۔ معروف صحافی مولانا عبدالباقی کی ادارت میں شائع ہونے والے اس اخبار میں ادارتی امور کے علاوہ شین ’’رنگ ترنگ‘‘ کے عنوان سے ایک مستقل کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ملک وملت کے مسائل کے علاوہ سیاسی صورت حال پر مبنی طنز ومزاح سے بھر پور یہ کالم اتنا چبھتا ہوا ہوتا تھا کہ لوگ اس کا بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔۱۹۶۷ء تک اس اخبار سے وابستہ رہنے کے بعد شین پٹنہ واپس آ گئے اور پہلے ’’پندار‘‘ اور بعد میں ’’سنگم‘‘ سے وابستہ رہے۔اسی زمانے میں ’’سنگم‘‘ کا کلکتہ ایڈیشن شائع ہوا تو شین کو وہاں کا انچارج بنا کر بھیج دیا گیا، جہاں تقریباً ایک سال انہوں نے اپنی خدمات انجام دیں۔اس زمانے میں دیگر کئی اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے۔ان کالم میں ہفتہ وار ’’روشنی‘‘

میں ’’داڑھی کے تنکے‘‘ اور ’’جلوۂ صد رنگ‘‘ کے عنوان سے تحریر کردہ ان کے کالموں کی دھوم رہی۔یہ کالم صرف حالات حاضرہ پر طنز ہی نہیں ہیں؛ بلکہ اپنے عہد کے دستاویز بھی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ان کالموں کا انتخاب شائع کیا جائے، اس کی اہمیت وافادیت مسلم ہوگی۔

۱۹۷۳ء میں سابق وزیر اعلیٰ بہار جناب عبدالغفور نے ایک اخبار ’’قومی دھارا‘‘ کے نام جاری کیا تو اس کی ادارت شین مظفر پوری کو سونپی گئی۔تقریباً دو سال تک یہ اخبار بہار کے سیاسی، ادبی اور سماجی افق پر چھایا رہا، اس کا سارا کریڈٹ شین کو جاتا ہے۔

شین کی صحافت کا آخری پڑاؤ بہار اردو اکادمی کا رسالہ ’’زبان وادب‘‘ ہے۔۱۵/اگست ۱۹۷۸ء سے جنوری ۱۹۸۳ء تک جس ذوق وشوق اور تندہی کے ساتھ انہوں نے ’’زبان وادب‘‘ کو ترتیب دیا وہ ادبی صحافت کا ایک سنگ میل ہے۔شین نے اکادمی کے اس رسالے کو جو معیار عطا کیا، وہ نہ قبل میں اسے حاصل تھا اور نہ بعد میں حاصل ہوا۔اسے ’زبان وادب‘ کا عہد زریں کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔اس زمانے میں ’’زبان وادب‘‘ میں شائع ہونا کسی کے لیے بھی فخر کی بات تھی۔عام شماروں کے علاوہ شین نے چار خصوصی نمبر نکالے، جو اس طرح ہیں: ۱۔شاد عظیم آبادی (۱۹۷۹ء) ۲۔سالِ اطفال نمبر (۱۹۹۷ء) ۳۔پرویز شاہدی نمبر (۱۹۸۰ء) اور ۴۔سہیل عظیم آبادی نمبر (۱۹۸۱ء)۔

یہ چاروں خصوصی شمارے یادگار اور تاریخی اہمیت کے حامل تو ہیں ہی، ان کی دستاویزی حیثیت بھی مسلم ہے۔یہ اپنی سلیقگی، معیار اور انداز پیش کش کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ’’حرف اوّل‘‘ کے عنوان سے شین مظفر پوری نے ’’زبان وادب‘‘ میں جو اداریے لکھے ہیں، ان میں سے اکثر میں زبان اور ادب کے حوالے سے انہوں نے جو گفتگو کی ہے، وہ اپنی زبان سے ان کی بے پناہ محبت اور ادب کے تئیں ان کے کمٹمنٹ کا اظہار یہ ہیں۔جینوین فنکار اور نو واردگان ادب کو انہوں نے ہمیشہ Promote کیا۔معیار سے انہوں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا اور نہ ہی کبھی ضمیر کا سودا کیا۔اردو صحافت کو شین نے نیا انداز، نئی زبان اور اونچی اُڑان کا جو منتر دیا ہے وہ ان کو بڑے صحافی کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

❋

منتخب تخلیقات

افسانے

دستک

ویسی ہی ایک رات تھی، خاموش اور چاندنی میں نہائی ہوئی۔ یہ آج سے ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ سارا گاؤں سو چکا تھا۔ میں اپنے مکان کی انگنائی میں لیٹا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ آسمان کا رنگ بالکل صاف تھا۔ اس کی نیلی پیشانی پر چودھویں کا چاند جھومر کی طرح دمک رہا تھا۔ آدھی رات جا چکی تھی۔ بوڑھا پڑوسی رہ رہ کر کھانسنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی کہیں سے کتّے کے بھونکنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں گاؤں کے کتّے خاموش رہ کر آرام کیا کرتے ہیں؛ کیوں کہ اندھیری راتوں میں چور چکار سے گاؤں کو خبردار رکھنے کے لیے انہیں پہرہ دینا پڑتا ہے۔

صبح مجھے پردیس جانا تھا؛ اس لیے وہ رات میرے لیے بہت قیمتی تھی۔ میرا ننھا بھائی جس سے میں بے حد محبت کرتا ہوں باتیں کرتے کرتے میرے پاس ہی سو گیا تھا۔ میری بیوی اب تک جاگ رہی تھی، آج اسے جاگنا ہی چاہیے تھا۔ گاؤں کی بیویاں پردیس جانے والے شوہر پر معمول سے زیادہ مہربان ہو جاتی ہیں اور ان کی محبت میں اتنی جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بات بات میں آنسو بھر لاتی ہیں اور پل پل میں ان کا دل اتھل پتھل ہو جاتا ہے، پھر میری بیوی تو بہت ہی جذباتی ہے۔ اسے تو

جیسے محبت کا دورہ پڑنے لگتا ہے ایسے موقعے پر؛ لیکن جب سے اس کی گود بھر گئی، وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگی ہے کہ میرے ساتھ اس کی گرم جوشیاں کم ہو گئی ہیں۔ اسے مجھ سے اس قدر پیار ہے کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ سارے زمانے کا پیار چھین کر مجھ پر نچھاور کر دیتی؛ لیکن آج اس کا پیار اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ شام سے ہی بچے کو بخار آ گیا تھا۔ آج تو خیر بخار کا بہانہ تھا، ورنہ ویسے بھی اس نے ایسے ضدی اور سرکش بچے کو جنم دیا ہے کہ ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔ بچے سے محبت تو اتنی کہ بس چلے تو سینے میں سما لے؛ لیکن جب اس کے رونے اور مچلنے سے زچ ہو جاتی ہے تو جھنجوڑ کر زمین میں پھینک دیتی ہے۔ آج بچے نے بھی رونے اور نہ سونے کی قسم کھالی تھی۔ وہ بستر سے الگ ہوئی نہیں کہ بچے نے رونا شروع کر دیا، جو عورت اپنے بچے اور شوہر دونوں سے انتہا پسندانہ محبت کرتی ہو، اس کی جان کبھی کبھی مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ مجھے رہ رہ کے اپنی بیوی پر ترس آ رہا تھا۔ اس وقت جو جذبہ اسے بے قرار کیے ہوئے تھا، مجھے اس کا احساس تھا۔ وہ ضرور سوچ رہی ہوگی کہ اگر آج کی رات وہ اپنی محبتوں کا اظہار نہ کر سکی تو نہ جانے میں اس کے بارے میں کیا خیال لے کر واپس جاؤں گا۔ معلوم نہیں پردیسی سے لوگ اس قدر محبت کیوں کرنے لگتے ہیں؟ اور گاؤں میں تو جس کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی کبھی نہ دیکھتا ہو، وہ بھی جب پردیس جانے لگتا ہے تو لوگ بڑی محبت سے پیش آتے ہیں، پردیس بسنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔

میری بیوی بدستور اپنے لاڈلے اور سرکش بچے کو تھپکیاں دے رہی تھی اور بچوں کی آنکھ مچولی کھیلنے والی نندیا کو بلانے کے لیے کوئی گیت گنگنا رہی تھی، کوئی ادھورا اور ٹوٹا پھوٹا گیت؛ کیوں کہ میری بیوی کی آواز میں تو پنجاب کے گیتوں کی کھنک اور بنگال کے نغموں کا رس ہے؛ لیکن اسے گانے کا شوق نہیں۔ اس وقت میں اپنی بیوی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید یہ کہ اگر اتنی بھولی اور سیدھی عورت کسی الہڑ اور تند مزاج مرد کے پالے پڑ جاتی تو بیچاری کا کیا حال ہوتا؟ میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوں۔ گاؤں میں بھی میرا رہن سہن شہریوں جیسا ہے، کبھی کبھی اونچے قسم کے شہری مجھ سے ملنے میرے گاؤں آ جایا کرتے ہیں اور میں خود بھی ملک کے بڑے بڑے شہروں میں گھوما پھرا ہوں؛ لیکن میری بیوی شہری اصطلاح میں گنوار ہے، پڑھنا لکھنا اسے بالکل نہیں آتا ہے۔ گو وہ میری کتابوں کا احترام بھی مجھ سے کم نہیں کرتی، لباس اور آسائش کے نئے پرانے فیشن سے بالکل ناآگاہ، پھر بھی میں اسے کبھی احساس کمتری میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ نہ اپنے شہری پن کو اس کے دیہاتی پن پر ترجیح دیتا

ہوں اور نہ اپنے پڑھے لکھے ہونے کا اس پر رعب ڈالتا ہوں؛ بلکہ میں اس کے ساتھ اس طرح پیش آتا ہوں، گویا میں اس کا شوہر نہیں، عاشق ہوں۔ شاید میری انہی باتوں نے اسے اس قدر موہ لیا ہے۔ عورت جب اچھی ہونے پر آتی ہے تو کتنی اچھی ہو جاتی ہے۔

میں اپنے پڑھے لکھے بے تکلف دوستوں میں گاہے گاہے اسے اندھی گونگی بہری کہا کرتا ہوں؛ لیکن میرے کہنے میں کسی بیزاری، یا تحقیر کا پہلو نہیں ہوتا؛ بلکہ محض اس کی سادگی اور معصومیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ ایک بار میرے ایک اور دوست نے جو اس کے رشتہ دار بھی ہیں، از راہ مذاق میری یہ بات اس کے کان میں ڈال دی اور اسے خلط ملط مطلب سمجھا کر بدگمان کر دیا، وہ کئی روز تک چپ چاپ رہی اور عجیب بے چارگی و کمتری کے انداز میں مجھ سے پیش آتی رہی۔ وہ جذباتی ضرور ہے؛ لیکن شکوے شکایت کی بات آسانی سے زبان پر نہیں لاتی اور جب میری اس کی کوئی بات ہو، تب تو وہ اور بھی گہری ہو جاتی ہے، جہاں چاندنی میلی ہوئی اور میں سمجھ جاتا ہوں کہ چاند پر ابر آ گیا ہے، جہاں جبیں پر شکن پڑی اور میں یقین کر لیتا ہوں کہ شیشے میں بال آ گیا ہے۔ اسے مجھ سے یہی توقع رہتی ہے کہ کھوئی کھوئی طبیعت اور اداسی اداسی آنکھوں کا حال خود ہی پوچھ لوں گا اور اس کی یہ توقع ہمیشہ پوری ہوتی ہے اور جب اس بار میں نے ''چپ'' اور اُداسی کی سراغ رسی کی تو وہ عادت کے مطابق آنکھوں کو جل تھل کر کے بولی۔ ''آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں دوستوں میں، میں تو گلے کا ڈھول ہوں، پھر لے آیئے نا کہیں سے میم اپنے لیے، سب دکھاوے کی باتیں ہیں۔۔۔''

میں کانپ ہی تو گیا، اس کی چپڑی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کمبخت دوست کے بچے کو کیا معلوم کہ اس عورت کے احساسات کتنے نازک اور لطیف ہیں۔ وہ تو بالکل ایسی ہے کہ ادھر نظر گئی، ادھر میلی ہوئی۔ ایسی عورت کے دل میں بدگمانی جتنی جلدی گھر کرتی ہیں، اتنی ہی دیر سے جاتی ہے۔ پورے دو گھنٹے تک امرت کے گھونٹ پلانے پڑے، تب جا کر اس زہر کا اثر زائل ہوا۔

میری بیوی کی گنگناہٹیں ختم ہو چکی تھیں، میں سوچا کہ شاید گنگناتے گنگناتے خود بھی سو گئی، اچھا ہے، بچاری کب سے پریشان تھی نٹ کھٹ بچے کے مارے۔ آج اس نے بناؤ سنگھار خوب کیا تھا، یہ اس کی عادت ہے، جس دن میں کہیں جاتا ہوں، یا کہیں سے آتا ہوں، اس دن وہ اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنتی ہے، ہر طرح کی سج دھج کرتی ہے، یہ بات جیسا کہ مجھے یقین ہے، اس نے بڑی بوڑھیوں سے سیکھی ہے۔ اس دن تو اس کا رنگ روپ چوتھی نہانے والی دلہنوں کی طرح نکھر جاتا ہے اور

میں اسے بڑی عاشقانہ نظروں سے دیکھا کرتا ہوں۔ آج اس نے شام کو پان بھی کھایا تھا۔ وہ پان کبھی نہیں کھاتی اور جب کھاتی ہے تو بڑا رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ہونٹ خون کی طرح دمک اٹھتے ہیں۔ بچے کی اچانک علالت نے سارے رنگ رس کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ بچارے ذرا دیر بیٹھ کر بات بھی نہ کر سکی مجھ سے، وہ سمجھ رہی ہوگی کہ اس کا روپ سنگار اکارت گیا؛ لیکن اسے کیا معلوم کہ میری نگاہیں اس کے ایک ایک سنگار کی داد دے چکی تھیں۔ یوں تو وہ نہارنے کی کم اور محسوس کرنے کی زیادہ ہے۔

اچانک پیچھے سے نرم اور شرمیلی آواز آئی۔

''سو گئے آپ؟''

میں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہ میرے سرہانے عجیب ادا سے ساڑی کا آنچل مسل رہی تھی۔ ہوا کی ایک نازک لہر اس کے بالوں سے چنبیلی کی خوشبو چرا کر میری سانس میں گھول گئی۔

میں نے کہا، ''بھلا آپ جاگ رہی ہوں اور غلام سو جائے۔''

وہ ہنس پڑی اور جیسے اس کا آنچل موتیے کے پھولوں سے بھر گیا۔ میرے ایک فقرے نے اسے نہال کر دیا۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر میرے بھائی کے بالوں سے کھیلنے لگی، جو چاندنی میں چمک رہے تھے، پھر وہ مخصوص لجیلے پن کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ بڑی سادی سادی باتیں بچوں جیسی بڑی کھلاوٹ ہے، اس کی آواز میں۔ اس وقت تو وہ مجھے پرانے زمانے کے قصے کہانیوں والی عورت معلوم ہو رہی تھی۔

رات ختم ہو گئی، باتیں ختم نہ ہو سکیں۔ وہ آنکھوں میں نیند کا خمار لیے چائے بنانے لگ گئی اور میں سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ ناشتہ اور چائے کے بعد میں بہت دیر تک گھر کے بچوں کو پیار کرتا رہا۔ باہر بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ان لڑکیوں کو بھائی کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ ان کے سارے گیت بھائی کی محبتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی تھیں۔۔۔ ''بھیا! ہمارے لیے تمہاری انگنائی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ اب کے واپس آ کر ہمارے ہاتھوں میں مہندی ضرور لگوا دینا۔'' اور میری نگاہیں جیسے یہ کہہ کر جھک گئیں۔۔۔۔ ''اچھا! اچھا ! ....اپنی سہیلیوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے گیت یاد کر لیں۔ اب کے ساون میں یہ حویلی گیتوں سے ضرور گونجے گی۔ اس انگنائی سے گیت اور قہقہوں کا چشمہ ضرور پھوٹے گا۔۔۔ ضرور۔۔۔'' اور اسی دم میں ایک گہری سوچ میں پڑ گیا، پھر میری نگاہ بیوی کی طرف اٹھی، جو چوکھٹ پر کھڑی کن آنکھوں سے

مجھے دیکھ رہی تھی، محبت اس کے دل سے چھلک کر آنکھوں میں آ گئی تھی، رات اس نے کہا تھا۔
''لوگ پردیس جا کر کتنے کٹھور اور نرموہی ہو جاتے ہیں!۔۔۔۔ پھر میری آنکھوں نے کسی اور کو ڈھونڈا۔ یہ تھی میری ماں؛ لیکن وہ تو مر چکی تھی۔ اس کی جگہ میری پھوپھی کھڑی تھی، جس نے سوتوں کا دودھ پلا پلا کر مجھے پالا تھا۔ بہت مشفق، بہت مہربان، بالکل ماں کی طرح، میرا دل بھر آیا۔ پھوپھی آگے بڑھ کر بلائیں لیں اور پیشانی چومی۔ میں نے جب دروازے کی طرف قدم اٹھایا تو چپکے سے بولی ''دیکھ لیا ہے نا اپنی بہنوں کو! پرایا دھن ہو چکی ہیں۔ بھائی برادری اور ٹولے پڑوس میں چرچے ہیں۔'' اور میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہاں ہاں، دیکھ لیا ہے میں نے۔ سن لیا ہے میں نے۔''
جب بیل گاڑی چل پڑی تو باپ نے لپک کر کہا۔ ''بیٹا لگان کی تاریخ سر پر آ گئی ہے۔ جاتے ہی انتظام کر دینا، بھولنا نہیں، بس جاتے ہی۔۔۔۔ اور میں نے جواب دینا چاہا تو میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

گاڑی گاؤں کے اونچے نیچے مکانوں سے نکل کر کھیتوں میں آ گئی، پھر قبرستان آیا، یہاں گاؤں کی سرحد ختم ہو جاتی ہے، جیسے یہ سرحد زندگی اور موت کا سنگم ہو، یہاں سے تو موت ہی شروع ہوتی ہے، زندگی کی رونقیں اور شادابیاں قبرستان کے اس پار ہی تو رہ جاتی ہیں۔ جب میں پردیس کو نکلتا ہوں۔ باپ، بیوی، بچہ بھائی، بہن اور پھوپھی، کھیت، باغ اور مویشی اور گاؤں کے کبھی نہ ختم ہونے والے رشتے ناتے، بس یہی تو کائنات ہے میری زندگی کی۔ یہاں سب کچھ ہے میرے لیے، صرف ایک چیز نہیں ہے۔ روپیہ۔۔۔! اور اسی کے لیے میں دیس بدیس مارا پھرتا ہوں۔ روپیہ سب سے بڑا ہے۔ اگر کتابوں میں لکھی ہوئی جنت زمین پر ہوتی تو اس میں بھی سب سے بڑا روپیہ ہوتا۔ کس نے ایجاد کیا تھا روپیہ! جہاں ......روپیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، وہیں سے انسانیت کے جسم میں زہر کی پہلی بوند داخل ہوتی ہے۔
گاڑی چلی جا رہی تھی، ریتلی سڑک کے ناہموار سینے پر دو گہری لکیریں کھینچتی ہوئی۔ پہیے کا ہر چکر مجھے مسرتوں سے دور اور دکھ درد سے قریب کر رہا تھا۔ دوسرے گاؤں کا پہلا مکان علاقے کے سب سے بڑے ساہوکار کا ہے۔ دوہرے بدن اور مکار آنکھوں والا ساہوکار، جس کے گوشت پر سور سے بھی زیادہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور جس کے چہرے پر خون ہی خون جھلکتا ہے۔ یہ خون غذاؤں کا ست نہیں، اس کی خوراک ہی خون ہے، جس طرح ماہی گیر اپنا جال پھینکتا ہے، اسی طرح اس نے

بھی سارے علاقے پر اپنا جال پھینک رکھا ہے۔ وہ ڈوری کھینچتا رہتا ہے۔ سونے اور چاندی کے ٹکڑے سارے علاقے کی خوشیاں اور جنتیں اس کے مکان میں سمیٹ سمیٹ کر لاتے رہتے ہیں۔ یہ مکان بہت مستحکم ہے۔ اس کی چھتوں اور دیواروں میں آہنی سلاخیں بچھی ہوئی ہیں اور اس کی بنیاد میں سونا پگھلایا گیا ہے۔ آندھی، برسات اور زلزلہ سب بیکار ہیں، اس کے آگے۔ آندھی پھوس کے چھپروں کو الٹ جاتی ہے۔ برسات مٹی کی دیواروں کو گھلا گھلا کر ڈھا جاتی ہے۔ زلزلہ پھوس کے چھپروں اور مٹی کی دیواروں کو زیروزبر کر جاتا ہے؛ لیکن یہ مکان اپنی جگہ پر صحیح سالم کھڑا رہتا ہے۔ رنگ و روغن پھیکا پڑ جاتا ہے تو قلعی کی نئی تہیں چڑھ جاتی ہیں۔ سرکی ہوئی اینٹیں جڑ جاتی ہیں اور پھٹی ہوئی دیوار مند ہو جاتی ہے۔
مجھے ساہوکار سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور میرے دماغ کی رگیں جیسے آگ کی لکیریں بنتی جا رہی تھیں۔ وہ آلتی پالتی مارے چبوترے پر ننگے بدن بیٹھا تھا۔ اس کے باپ نے میری دادی اور ماں کا ہار سنگار لوٹ کر اپنی دولت کا اضافہ کیا تھا اور اس نے میری بیوی کی آرائش وزیبائش چھین کر سونے کے ڈھیر کو اونچا کیا ہے۔ اگر اس کا بس ہوتا تو وہ تن کے لتّے بھی نوچ لیتا۔۔۔۔ خودغرض! ہلکی اور تازہ دھوپ میں اس کا جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔
گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی میرے خیالات کا چکر پہیے کے چکر سے زیادہ تیز تھا۔ ایک چھوٹے سے گڑھے میں اٹک کر گاڑی زور سے ہچکولا کھا گئی، دماغ کو جھٹکا لگا اور خیالات کے آبگینے ٹوٹ گئے۔ تھوڑی دیر تک جذبات میں ہلچل مچی رہی، ڈسٹرکٹ بورڈ کی اونچی اور کشادہ سڑک پر پہنچ کر ذرا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔
سامنے سے دو راہ گیر عورتیں تھکے تھکے قدم اٹھاتی آ رہی تھیں۔ منہ اندھیرے گھر سے نکلی ہوں گی۔ کہیں دور جانا ہوگا انھیں۔ جوان عورت کے سر پر ایک بھاری گٹھری تھی اور چہرے پر تیل چپچپا رہا تھا۔ سندور سہاگ اور جوانی کی علامت ہے؛ اس لیے وہ سہاگن بھی تھی اور جوان بھی۔ کپڑے بوسیدہ سہی، رنگت میلی سہی؛ لیکن وہ اتنی ہی سہاگن تھی، جتنی ساہوکار کی بیٹی اور بہو؛ لیکن اس کا شوہر اسے سونے کی کٹوری میں دودھ نہیں پلاتا ہوگا، اس کی چمکدار آنکھوں سے دل کی روشنی پھوٹ رہی تھی اور ہلتے ہوئے ہونٹوں سے گیت برس رہے تھے۔۔۔۔۔ ایک ان دیکھی روشنی اور ایک ان سنا گیت۔ اس کی ایک اجنبی سی نگاہ میری طرف اٹھی اور مرعوب ہو کر جھک گئی۔ بوڑھی عورت

زور زور سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ گرہستی کی باتیں ان کے کھردرے پاؤں کو نرم اور مرطوب ریت میں دھنستے دیکھ کر مجھے اپنے سینے میں گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی۔

گاڑی بان نے ہلکے سروں میں ''بارہ ماسا'' گانا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر، کیا دیکھ کر یکایک اس کی طبیعت میں ترنگ آ گئی تھی۔ بڑی بھدی اور بے سری آواز تھی کمبخت کی۔ جی چاہا منع کر دوں، پھر خیال آیا کہ کیوں اس کے ذوق کو مجروح کیا جائے۔ یہی تو چند تہہ خانے ہیں ان کی خوشیوں کے، جہاں تک ساہوکار کی سرنگ نہیں پہنچ سکتی، ورنہ باقی سب کچھ تو موت ہے ان کے لیے۔ میری طرح ان کا سرمایۂ مسرت بھی محدود ہے۔ بیوی کی مسکراہٹ، بھائی بہنوں کا پیار، باپ کی شفقت اور پھوپھی کی ہمدردیاں اور چند بے ربط گنگناہٹیں کبھی کبھی تو زندگی کے ان ٹوٹے پھوٹے سہاروں کی طرف سے بھی دل کھٹا ہو جاتا ہے اور موت پیاری محسوس ہونے لگتی ہے؛ لیکن میں جھنجلا کر پھر سنبھال لیتا ہوں۔ موت شکست ہے، شکست کی تلخی زندگی کی تلخی سے زیادہ بدذائقہ ہے۔ امرت کی اوس پی کر زہر کا سمندر میٹھا نہیں ہو سکتا؛ لیکن اس کا زہریلا پن تو کم ہو جاتا ہے اور اسی طرح زہر گھٹتا رہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن امرت کے بادل ٹوٹ کر برس جائیں۔ میری کمزور زندگی کا مضبوط حوصلہ پھر موت کو للکارنے لگتا ہے۔

گاڑی تیسرے گاؤں سے نکل کر چوتھے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اسٹیشن تھا۔ گاڑی بان ''بارہ ماسا'' گاتے گاتے تھک کر چپ ہو چکا تھا۔ سڑک کے کنارے ببول کے درخت کے نیچے ایک بکرے کو ذبح کر کے الٹا لٹکا دیا گیا تھا اور اس کے قریب ہی ایک تندرست کتّا زمین پر بہے ہوئے گاڑھے خون کو بڑی رغبت سے چاٹ رہا تھا۔ کتا کتنا خوبصورت اور صحتمند تھا! روئیں میں ہمواری اور چمک، جسم بھرپور اور موزوں، وہاں جو لوگ کھڑے تھے، ان سب سے زیادہ یہ کتا تندرست اور خوش منظر تھا، چند کمزور کتے الگ کھڑے چمکتے ہوئے لہو کو للچاتی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی ذرا سی حرکت پر بھی شہ زور کتا دانت نکوس کر غرانے لگتا تھا۔ یہ کتا اس قدر تندرست اور خوبصورت اس لیے تھا کہ اس نے مذبح میں پرورش پائی تھی، وہ صرف خون چاٹتا تھا، غذاؤں کا سَت، بالکل ساہوکار کی طرح، یہ دونوں خون پیتے تھے، ایک جانور کا دوسرا انسان کا؛ لیکن کہتے ہیں کہ مذبح کے کتوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے؛ کیوں کہ خون کی نامطلوب فراوانی سے ان کے پھیپھڑے سڑ جاتے ہیں۔ ساہوکار کے پھیپھڑے بھی سڑ جائیں گے، جو خون وہ سونے کی نلکی کے ذریعے کشید

کرتا ہے، وہ صالح نہیں، اس میں دکھ درد کا زہر ہے۔

گاڑی بان نے اچانک للکارا بھر کر دونوں بیلوں کی دم مروڑ دی اور گاڑی ڈھلملاتی ہوئی تیز بھاگنے لگی۔ میرے خیالات کے تانے بانے پھر الجھ گئے۔ میں نے پان کی پیک پھینک کر گاڑی بان سے کہا ''ابھی ٹرین آنے میں کافی دیر ہے۔ گھبراہٹ کاہے کی ہے؟''

گاڑی بان بولا ''یہ بات نہیں بابو صاحب۔ ذرا دیکھئے نہ پچھّم میں۔''

میں نے نگاہ اٹھائی تو کچھ ڈر سا گیا۔ کئی میل دور جہاں کھیتوں کی حد ختم ہو جاتی ہے، سیاہ گھنیری بدلیاں بڑی ہیبت ناک شکل لے کر اٹھ رہی تھیں، جیسے کالے بادلوں کے پہاڑ زمین سے آسمان کی طرف اٹھ رہے ہوں۔ ہوا ساکت ہو گئی تھی اور پھیلتے ہوئے بادلوں کی آغوش میں طوفان امنڈ رہا تھا۔ ایک تاریکی پچھّم سے پورب کی طرف لپک رہی تھی۔ دھوپ بھاگ رہی تھی اور تاریک سایہ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ باتیں مجھے اس طرح یاد ہیں، جیسے کل کی ہوں۔

گاڑی بان نے پوچھا ''آگے چلوں، یا پیچھے موڑ لوں؟''

میں عجیب شش و پنج میں پڑ گیا، آگے اسٹیشن تھا اور پیچھے گاؤں، گاڑی بیچوں بیچ میں پھنس گئی تھی، طوفان تھا کہ اب آیا اور اب آیا۔ میں نے کہا ''طوفان سر پر آ گیا ہے، بس سامنے پل پر گاڑی روک دو۔'' اسی دم ہوا کا ایک تیز اور بوجھل جھونکا دھان کے کھیتوں میں سرسراتا ہوا کہیں دور جا کر ناپید ہو گیا۔

ابھی ہم پل تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ طوفان نے ہمیں آ لیا۔ گاڑی بان تیزی سے جوا اتار دیا اور ہم دونوں پہیے کی اوٹ میں دبک گئے، اُف کتنی گرج اور گونج تھی اس طوفان میں، جیسے فضا کے سینے میں صدیوں کا محبوس طوفان یکبارگی اپنا راستہ پا گیا ہو۔ سڑک کے کنارے کنارے تاڑ اور املی کے پیڑوں کو ہوا اس طرح مروڑ رہی تھی جیسے یہ جڑ سے اکھڑ کر فضا میں اڑ جائیں گے۔ رفتہ رفتہ آندھی کا زور کم ہوا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک کی ریت کیچڑ بن گئی اور کھیتوں میں پانی گرنے کی گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی۔ بارش کے زور میں اتنا قہر و غضب تھا، جیسے ہمیشہ بے وقت برسنے والے بادل کھیتوں اور کسانوں سے انتقام لے رہے ہوں۔ بارش کے ساتھ ننھے ننھے اولے بھی پڑنے لگے۔ ہم دونوں سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگے تھے۔ ہاتھ پاؤں میں جھریاں پڑ گئی تھیں۔

ایک گھنٹہ کے بعد بارش تھم گئی۔ گاڑی بان بری طرح کپکپا رہا تھا۔ میں نے اس کا حوصلہ

بڑھایا ''گھبراؤ نہیں، اسٹیشن پہنچ کر خوب گرم گرم چائے پییں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں چل کر کپڑے بدلیں گے۔''

گاڑی بان بولا ''بابو صاحب، گھر لوٹ چلیے، نہ جائیے، آپ کے سفر کا شگون کچھ اچھا نہیں۔''

میں نے گیلی سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا ''یہ کوئی بات نہیں، میں نے زندگی میں کبھی قدم آگے بڑھا کر پیچھے نہیں ہٹایا اور یہ طوفان! یہ تو آتے ہی رہتے ہیں، میں سفر نہ کروں، تب بھی آتے ہی رہیں گے۔''

میری شاعری تو گاڑی بان کی سمجھ میں کیا آئی ہوگی؛ لیکن میرا مطلب وہ ضرور سمجھ گیا اور خاموش ہوگیا۔

اسٹیشن پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے یہاں کپڑے بدلے، گیلے کپڑوں اور بستر کو ہوا میں پھیلا دیا، پھر تین چار پیالیاں چائے کی پی گئیں۔ دوپہر تک تیز دھوپ نکل آئی۔ کپڑے اور بستر گیلے ہو جانے سے دوپہر کی ٹرین چھوڑ دینی پڑی۔ رات کی گاڑی سے روانہ ہوگیا۔

گھر کی جدائی بہت شاق گذر رہی تھی، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا، گھر چھوڑ کر پردیس جانا میرے لیے بہت ہی معمولی بات تھی۔ کسی نے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میرے چہرے پر میل نہیں دیکھا تھا، میں تو بچپن سے ہی سفر اور پردیس کا عادی ہوں؛ لیکن اس بار میں اپنے آپ کو کچھ کمزور سا محسوس کر رہا تھا۔ یا تو گھر والوں سے زیادہ محبت ہوگئی تھی، یا حوصلہ چھوٹ رہا تھا۔ آج میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب کے واپس آ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ گاؤں کے آس پاس ہی روزی روزگار کا کوئی دھندا کر لوں گا۔

ٹرین اڑی جا رہی تھی، انجن اور پہیوں کا شور جیسے مجھے سمجھا رہا تھا کہ حرکت زندگی ہے، سکوت موت ہے۔ لوگ بڑی تنگی کے ساتھ گڈمڈ ہو کر بیٹھے تھے۔ میرے بنچ کے پرلے سرے پر ایک لڑکی بھنچ بھنچ کر آدھ مری ہوئی جا رہی تھی، وہ رحم طلب نگاہوں سے کبھی اپنے بوڑھے ساتھی کو دیکھنے لگتی اور کبھی دوسرے مسافروں کو۔ ایک آدھ اچٹتی بھٹکتی نگاہ میری طرف بھی آجاتی تھی۔ مجھے تو اس پر اتنا ترس آیا کہ پلکوں پر بٹھا لینے کو جی چاہا؛ لیکن اس وقت میری پلکوں سے زیادہ قابل قدر لکڑی کی سیٹ تھی، جس کے صرف چند انچ میں وہ ربڑ کی طرح بھنچی ہوئی تھی، اس کی شرمیلی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آگئی، پھر بیوی یاد آئی، پھر بھائی، پھر باپ۔۔۔ پھر سارا گھر۔۔۔ سارا گاؤں اور ساہوکار اور پھر اگلے ساون کی رُت کا سماں نگاہوں میں پھرنے لگا۔ کھڑکی سے باہر ڈھلی ہوئی چاندنی میں نہ جانے میری

آنکھوں نے کس طرح یہ دیکھ پایا کہ میری بہنیں اپنی کسی سہیلی سے سرگوشی کر رہی تھیں۔۔۔۔ شاید یہ کہ اب ساون میں۔۔۔۔ ہاں اب کے ساون میں ہماری حویلی گیت اور قہقہوں سے گونجے گی اور حویلی کے پچھواڑے مہندی کا پیڑ لنڈ منڈ ہو جائے گا۔۔۔ اور پھر جیسے سہیلی کی آنکھیں یہ سن کر بھر آئیں۔

انھیں پریشان اور دکھ بھرے خیالات میں سفر ختم ہوگیا۔ ایک دن اور دو راتوں کا تھکا دینے والا سفر، پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہی کسی نے میرے کان میں کہا ''لگان کی تاریخ سر پر آگئی ہے۔'' اور دوسرے کان میں کسی نے کہا ''بھائی برادری اور ٹولے پڑوس میں چرچے ہیں۔'' میں تیزی سے لپک کر تانگے میں بیٹھ گیا، تانگہ تین چار منٹ کے بعد شہر میں داخل ہوگیا۔ گیتوں اور قہقہوں کی دنیا ہر طرف گیت اور قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے بھی اپنے گھر اور اپنی بہنوں کے لیے چند تانیں اور قہقہوں کی چند لڑیاں خریدنی تھیں۔۔۔ گیت اور قہقہے۔۔۔ ذرا دیر کے لیے میرا دماغ گیت اور قہقہوں سے بھر گیا۔

۔۔۔ اور آج پورے ڈیڑھ سال کے بعد میں اپنے گاؤں واپس آیا ہوں۔ وہی گھر ہے، وہی انگنائی ہے، وہی پلنگ ہے، وہی بستر ہے، وہی رات اور وہی چاندنی ہے، ساون آیا تھا، گذر گیا، دوسرا ساون آیا، وہ بھی گذر گیا اور اب تیسرے ساون کا انتظار ہے۔ میری جھولی گیت اور قہقہوں کی اشرفیوں سے خالی ہے، میرا دل زخمی ہے اور دماغ سو گیا ہے۔ میری روح خون میں نہائی ہوئی ہے، جذبات جھلس گئے ہیں۔ میں ایک سال تک آگ اور خون کی ندی تیرتا رہا ہوں۔ پہلے ملک غلام تھا، اب آزاد ہو گیا ہے۔ پہلے گیت قہقہوں کا اجارہ انگریز کے پاس تھا، اب وہ ٹھیکہ ملک کے لوگوں کے ہاتھ آگیا ہے۔ انھوں نے تمام گیت اور قہقہوں کو اپنے محلوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اب تو ہر طرف موت کے راگ سنائی دیتے ہیں، جب ملک کے اونچے ایوانوں پر آزادی کا پرچم لہرایا گیا تھا، اس وقت بھی گیت اور قہقہے ناپید ہو چکے تھے، چیخیں اور کراہیں فضا میں تیرتی پھر رہی تھیں۔ فرنگی جادوگر نے نہ جانے کون سا منتر پڑھ پھونک دیا تھا کہ دانت کاٹی روٹی کھانے والے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ میں نے انسان کی لاش گدھوں کو نوچتے دیکھا ہے۔ میری آنکھوں نے شیر خوار بچوں کو دودھ کے قطروں اور پانی کے گھونٹ کو ترس ترس کر دم توڑتے دیکھا ہے۔ نسوانی حرمت و تقدس کو شہوانیت کے مقتل پر تڑپتے دیکھا ہے۔ میں نے ہوا اور پانی میں خون کی بو سونگھی ہے، میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اس سے کہیں بہتر یہ تھا کہ کسی کی چمچماتی ہوئی تلوار میرے سینے کے پار ہو جاتی، یہ ذرا دیر کی اذیت ہے؛ لیکن جو کچھ میری یاد داشت کو بچھو کا ڈنک بن ڈستا ہے، وہ ایک مستقل درد ہے۔ روح کی مستقل پھانس ہے، ایک ایک دن

میں کئی کئی بار مرتا ہوں، اب مرتے مرتے تھک گیا ہوں۔ میں اپنے ذہن پر سے موت کی پرچھائیں ہٹا کر زندگی کے نقش و نگار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں گھبرا کر اپنے گاؤں بھاگ آیا۔ ذرا یاد دھندلی پڑ جائے گی تو پھر کسی دیس نکل جاؤں گا ۔ ۔ ۔ گیت، قہقہوں اور نقش و نگار کی تلاش میں۔

میرا بچہ سینے پر سو گیا ہے۔ میرا ننھا سا بھائی سائبان میں اپنی بہنوں کے پاس سو رہا ہے، میرا بچہ جو ابھی صرف تین چار الفاظ کے فقرے بول سکتا ہے، سونے سے پہلے نہ جانے کیا کہتا رہا ہے، وہ بالکل اپنی ماں کی طرح باتیں کرتا ہے۔ رُک رُک کر سوچ سوچ کر، آج شام کو وہ بہت رویا ہے، اس کی کبوتر جیسی وحشی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں، اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی ماں مر گئی، آج سے کئی مہینے پیشتر، وہ اچانک نہیں مری، وہ تو آہستہ آہستہ انچ بہ انچ موت کی دلدل میں دھنستی رہی، دریا کی لہریں ساحل کو کاٹتی رہیں، موت کی ریتی زندگی کی گردن پر چلتی رہی، اس کا مرض اپنی دوا کا انتظار کرتا رہا، جس طرح میں اپنی بہنوں کے لیے گیت اور قہقہے نہ خرید سکا، اسی طرح میرا باپ اپنی بہو کے لیے آبِ حیات نہ لا سکا؛ لیکن مجھے تو وہ آج بھی زندہ محسوس ہوتی ہے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کے ایک کونے سے اس فرشتے کی مسکراہٹیں پھوٹ رہی ہیں۔ آج بھی ہوا کی کوئی نازک سی مہکی ہوئی لہر میری سانس میں گھل جاتی ہے۔ میں نے آج اسے لجیلے پن کے ساتھ ہنس کی طرح اس انگنائی میں چلتے پھرتے دیکھا ہے؛ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گئی، وہ کسی ان دیکھے دیس کو سدھار گئی۔

میں زیادہ دیر تک حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا، وہ مر چکی ہے، میرا بچہ بھی یہی کہتا تھا، اسے گھر والوں نے بتایا تھا کہ تمہاری ماں تمہارے باپ کو بلانے چلی گئی ہے؛ لیکن آج ایک بہت بڑی حقیقت اس کے ننھے سے دماغ میں بھی سما گئی، میری بیوی مر گئی؛ لیکن ساہوکار زندہ ہے۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سرخ اور صحت مند نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے مکان پر ایک منزل اور کھڑی کر لی ہے؛ لیکن انسانیت کے کرب و سوز سے آسمان کی تہوں میں انگارے دہک اُٹھے ہیں اور زمین کی چھاتی میں جوالا کھول رہی ہے، انگارے برسیں گے اور جوالا پھٹے گی۔ میرا دماغ ایک دھمک محسوس کر رہا ہے۔ اس دھمک کے پیچھے مجھے گیت اور قہقہوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ انسان کا ذہن بھی عجیب ہوتا ہے۔ مجھے رہ رہ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری سانس گھٹ رہی ہے، میری نبض چھوٹ رہی ہے اور گلے میں ایک چیخ باہر نکلنے کے لیے چکر کاٹنے لگتی ہے۔ اسی دم مجھے سنائی دیتا ہے، جیسے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے اور میں چونک پڑتا ہوں۔

ودّیانگر کی مسجد

ودیانگر کی مسجد زبان حال سے مسلمانوں کی غیرت اسلامی اور حرارت ایمانی کا نوحہ پڑھ رہی تھی؛ مگر اس کو سننے والا بھی آندھیوں کی زد پہ جلنے والے ایک چراغ بابو رام کنور کے سوا کوئی نہ تھا، جن کے قلب کو پوری انسانی تاریخ سے چھین کر پھوٹنے والی کرن نے منور کر دیا تھا۔ وہی نور اس چراغ کو آندھیوں کی زد پہ بھی روشن کئے ہوئے تھا اور اسی نور نے بابو رام کنور کو ودیانگر کی اس چھوٹی مسجد کا خاموش محافظ بنا دیا تھا۔

نہ جانے تاریخ کے کس تاریک لمحے سے یہ سجدہ گاہ کس مپرسی کا شکار چلی آتی تھی، کچی دیواروں اور کھپریل کی یہ چھوٹی سی مسجد مردہ ایمان کی شکستہ قبر بن کر رہ گئی تھی۔ مٹی کا ایک گھڑا اور دو تین بدھنیاں، جن کے اندر کائی جمی ہوئی تھی، ٹین یا ردّی کانسے کا ایک زنگ خوردہ چراغ اور دو تین پرانی چٹائیاں ــــــ بس یہی کل کائنات تھی، خالقِ کائنات کے اس گھر کی ــــــ پچیس تیس سال سے قصبہ کے ایک نادار اور لاولد میاں جی اس میں جھاڑو اور اذان دیتے آ رہے تھے۔ امام اور مقتدی بھی یہ خود ہی تھے۔ ہاں کبھی کبھی شام کو کوئی عورت بچے کو پھنکوانے، یا تیل اور پانی پڑھوانے مسجد کی چوکھٹ پر آ جایا کرتی۔ بھولے بھٹکے کوئی ہندو عورت بھی اس کام کے لیے آ جایا کرتی، یا پھر گاہے گاہے کوئی نمازی راہ گیر بھی اس میں سجدے کر لیا کرتا اور مسجد پر حسرت کی نظر ڈالتا ہوا چل دیتا۔ یہ بات تو صرف میاں جی جانتے تھے کہ مسجد کا چراغ بھی بابو رام کنور کے تیل سے جلتا تھا۔ وہاں کے کسی مسلمان کو اس سے بھی غرض نہ تھی کہ چراغ جلتا بھی ہے، یا نہیں؟ اور اذان ــــــ؟ وہ تو میاں جی دیتے تھے اور بابو رام کنور سنتے تھے، خاص کر صبح کی اذان۔

بابو رام کنور کو کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کی بڑی لگن رہتی تھی۔ انھوں نے میاں جی سے اذان کا ترجمہ بھی پوچھ رکھا تھا۔ ایک بار انھوں نے پوچھا تھا ''میاں جی، وہ فجر کی اذان میں ایک بول زیادہ ہے ــــــ وہ ــــــ ذرا کہیے تو ــــــ'' اور جب میاں جی نے پڑھا: ''الصّلوٰۃُ خیرُ مّنَ النّوم'' تو بابو رام کنور بولے ''ہاں وہی، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' اور جب اس کا مطلب میاں جی نے بتایا کہ نماز نیند سے بہتر ہے تو بابو رام کنور پھڑک اٹھے اور بولے ''ہاں پَو پھٹے مندر کے گجر کی آواز بھی نیند کے ماتے انسان کو ایشور کی طرف بلاتی ہے۔''

یہ چھوٹا سا قصبہ ودیانگر جس کی خاک سے بابو رام کنور جیسا ہیرا چمکا۔ان کے خاندان کی انسانی عظمتوں کے طفیل ہی زیادہ مشہور ہوا۔ پورا قصبہ ہندوؤں سے آباد تھا، جو زیادہ تر خوشحال اور تعلیم یافتہ تھے۔قصبہ میں سیاست کی گرمی کم اور تجارت و زراعت کا رواج زیادہ تھا۔زیادہ پڑھے لکھے لوگ شہروں میں ملازمت پر تھے۔ودیانگر اور اس کے گردونواح میں جو عزت اور قدر بابو رام کنور کی تھی، وہ کسی کی نہ تھی۔سیاست کی سرد و گرم ہوا سے ان کا روشن ضمیر ہمیشہ محفوظ رہا۔مسجد کے اردگرد جو دس بارہ مسلمان گھر آباد تھے، وہ کسی شمار میں نہ آتے تھے۔وہ سب کے سب غریب اور مزدور پیشہ لوگ تھے۔ان کی عورتیں بھی مشقت اور جفاکشی کی زندگی گزارتی تھیں۔ان پچاس ساٹھ مسلمانوں میں دو چار قدرے سفید پوش اور ادھ کچرے پڑھے لکھے بھی تھے۔یہ مختصر سی مسلم آبادی بھی رام بابو کنور کے آباواجداد کی بسائی ہوئی تھی اور جیسا کہ مشہور تھا اس چھوٹی سی مسجد کے لیے زمین بھی ان کے پرکھوں ہی کی دی ہوئی تھی۔

ودیانگر کے پسماندہ مسلمانوں میں صرف ایک صاحب مبارک علی تھے، جو زیادہ پڑھے لکھے تھے اور خود اپنے وقت میں طرح طرح کی ترکیبوں سے ترقی کر کے کافی خوشحال ہو گئے تھے۔وہ کاشتکاری کے علاوہ سیاست کے پیشے میں بھی تھے۔سیاسی لوگوں اور سیاسی چکروں ہی میں ان کے شب و روز گزرتے تھے۔دوبار الیکشن ہار چکے تھے۔آلودہ سیاست اور زمانہ سازی کے انھوں نے کیا کیا نہ سبق پڑھ رکھے تھے۔اپنے سیکولر اور روشن خیال ہونے کا معیار اور ثبوت ان کے پاس یہی تھا کہ وہ اپنے مذہب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اپنی شخصیت سے اپنے مذہب کی ہر شناخت کو کھرچ پھینکنا چاہتے تھے۔اپنا نام بھی پسند نہیں تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ بابو رام کنور کی بیٹھک میں اس مسجد کی ویرانی اور کس مپرسی کی بات نکل آئی۔ لوگ مسلمانوں کی بے حسی کا مذاق اڑانے لگے۔مبارک علی بھی موجود تھے۔غیرت دلانے والے ہندوؤں کا مونہہ بند کرنے کے لیے وہ بول پڑے ''یہ سب فضول اور ڈھکوسلہ ہے۔خواہ مخواہ ایک ڈیڑھ کٹھ زمین کو غصب کر رکھا ہے، جسے نماز و ماز کا شوق ہو تو گھر میں بھی جگہ کم نہیں ہوتی۔''

مبارک علی سمجھتے تھے کہ اس بات پر ہندو ان کو شدھ سیکولر مان کر خوش ہو جائیں گے؛ مگر ہوا یہ کہ لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور بابو رام کنور حقارت کی نظر سے مبارک علی کا خفت زدہ چہرہ دیکھتے رہ گئے۔اس دن سے ان کو مبارک علی سے نفرت اور چڑ ہو گئی۔بابو رام کنور نے ہر مذہب اور ہر مذہبی

پیشوا کے احترام کی تعلیم دینے والے پیغمبر اسلام کی سوانح عمری پڑھ رکھی تھی، جو بدنصیب مبارک علی نے یقیناً نہیں پڑھی ہوگی اور مبارک علی کو اس کا علم نہیں تھا کہ تاریخ کی سب سے پہلی مسجد بانیٔ اسلام نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی۔

بابو رام کنور موذن میاں جی کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور غریب کی طرح طرح سے مدد بھی کیا کرتے۔بعض مسلمانوں کو تو بس رمضان کے مہینے میں یہ توفیق ہو جایا کرتی کہ میاں کے لیے افطاری اور سحری کا بندوبست کیا کرتے اور عید کے کپڑے سلوا دیا کرتے؛ مگر میاں جی کی بیوی کو عید کے کپڑے بابو رام کنور ہی دیا کرتے۔شاید محض ایک ناگزیر رسم کے طور پر یہاں کے مسلمانوں میں روزے کی حس بیدار ہو جایا کرتی۔عورتیں تو ساری کی ساری روزے رکھتیں؛ مگر مبارک علی نہ صرف یہ کہ ان رسمی توفیقوں سے محروم تھے؛ بلکہ موقع بہ موقع روزہ داروں پر پھبتی بھی کستے رہتے۔عیدگاہ ایک میل دور پڑوس کے ایک گاؤں میں تھی۔بابو رام کنور عید کی صبح قصبہ کے چار آدمیوں کے ساتھ عید کی چہل پہل دیکھنے ذرا دیر کے لیے وہاں بھی پہنچ جایا کرتے۔نہ جانے کون سی مجبوری، یا مصلحت مبارک علی کو بھی عیدگاہ تک کھینچ لے جایا کرتی اور وہ اس کو ایک غیر سیکولر فعل سمجھ کر شرمندہ شرمندہ سے نظر آنے کی کوشش کرتے، اس ماحول میں وہ بابو رام کنور کو اجنبی محسوس کرتے۔

ایک موقع پھر آیا جب مبارک علی نے بابو رام کنور کے احساسات کو مجروح کیا۔ان دنوں بابو رام کنور قصبہ کے پرانے مندر کی توسیع اور نئی تعمیر کے لیے ایک لاکھ کا فنڈ جمع کرنے کی مہم چلائے ہوئے تھے۔اتفاق سے اس موقع پر اسمبلی کے الیکشن کی بھی آمد آمد تھی۔مبارک علی اس بار ودیانگر کے حلقے سے ہی کھڑا ہونے کا بندوبست کر چکے تھے اور زمین ہموار کرنے میں سرگرم تھے۔ایک دن بابو کنور کا آشیرواد لینے کو حاضر ہوئے، اس وقت بیٹھک میں دو تین آدمی اور تھے۔

مبارک علی کی بات ختم ہوئی تو بابو رام کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا ''آپ جانتے ہیں کہ میں دھارمک ہوں اور سماجی کاموں کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی نہیں رکھتا اور سیاست سے تو اور بھی نہیں۔''

ایک خوشامدانہ ہنسی کے ساتھ مبارک علی بولے ''وہ تو میں جانتا ہوں، پھر بھی آپ کی چھتر چھایا بڑی چیز ہے۔''

''سب سے بڑی چھتر چھایا ایشور کی ہوتی ہے۔''

''بیشک بیشک؛ مگر بھگوان کی دیا کے لیے بھی آپ کا آشیرواد چاہیے۔''

اس کے بعد مبارک علی اغل بغل دیکھنے لگے، جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اسی اثنا میں دو آدمی اور آ گئے۔ ایک شخص نے بابورام کنور کو پانچ سو روپے پیش کرتے ہوئے کہا ''مندر کے فنڈ میں جمع کر دیجئے۔''

ابھی بابورام کنور روپے گن کر سنبھال ہی رہے تھے کہ دو تین آدمی اور پہنچ گئے۔ ان آدمیوں کے آتے ہی مبارک علی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پھولا ہوا لفافہ بابورام کنور کے آگے رکھتے ہوئے گویا بڑے فخر سے اعلان کیا ''اس نیک کام میں یہ تین ہزار روپے میرے نام بھی لکھ لیجئے۔''

معاً بابورام کنور کے اندر جیسے ایک کوندا سا لپکا اور ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غصہ ضبط کرتے ہوئے ہونٹ کپکپا گئے، آدمی مہذب تھے، زبان پر قابو رکھتے ہوئے نہایت حقارت سے بس اتنا کہا ''مبارک علی اٹھ جائیے، کم از کم میں اپنا ووٹ آپ کو ہرگز نہ دوں گا۔

مبارک علی ہکّا بکّا رہ گئے۔

بابورام کنور کا غصہ ان کی سمجھ میں نہ آیا، کسی کی سمجھ میں نہ آیا، سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے، کچھ ایسا سماں ہوگیا کہ جاتے ہوئے مبارک علی کو اپنا لفافہ اٹھانے کی بھی ہمت نہ ہوسکی، جب وہ باہر نکل رہے تھے تو مسجد کے میاں جی کراسن تیل کی خالی بوتل لیے بیٹھک کی طرف بڑھ رہے تھے۔

یہ واقعہ شام ہوتے ہوتے پورے قصبہ میں؛ بلکہ گرد و نواح کی بستیوں میں مشہور ہوگیا۔ قیاس آرائیاں طرح طرح کی تھیں؛ مگر اصل بات بابورام کنور نے شاید میاں جی ہی کو بتائی تھی، جو اس واقعہ کے تیسرے ہی دن سے گھر میں بیمار پڑے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ مسجد سونی پڑی تھی۔

پانچویں دن بھی مسجد میں اذان نہ ہوئی، ذرا مونہہ اندھیرے بابورام کنور کی جو آنکھ کھلی تو انھیں کچھ عجیب سا لگا، نہ جانے کتنے برسوں سے ان کے کان صبح کی اذان کی آواز سے مانوس چلے آئے تھے۔ یہ آواز ان کے لیے گھڑی کی الارم کا کام کرتی آئی تھی، اذان سنتے ہی وہ کچھ جاپ کرتے، اٹھ بیٹھتے اور پھر اشنان وغیرہ اور پوجا پاٹ کی تیاری میں لگ جاتے، انھیں لمحوں میں مندر کے گجر کی ہلکی ہلکی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ مندر ذرا دور تھا اور مسجد پڑوس میں تھی، اس مسجد سے کچھ جذباتی لگاؤ کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے باپ دادا بھی اس کا احترام کرتے آئے تھے؛ بلکہ ایک بار ان کے خاندان نے اس کو ایک خطرے کی زد سے بھی بچایا تھا۔ اپنے سورگیہ پتا کی طرح وہ بھی ''ایشور اللہ تیرے نام'' کے قائل تھے۔ آدمی صاف دل اور سلجھے ہوئے ہونے کے علاوہ خاصے تعلیم یافتہ بھی تھے۔ ہاں ان کا علم اس مقام

پر نہیں پہنچتا تھا، جہاں انسان اپنی اصلیت اور خدا کی حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے، وہ ایسے لوگوں سے نالاں تھے، جو مذہب پر عمل تو نہیں کرتے؛ مگر مذہب کے نام پر شور بہت مچاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ دکھی بھی تھے کہ مذہب انسان کے لیے اندر کی روشنی اور باہر کا لباس نہ رہا۔ انسان اندر سے تاریک اور باہر سے ننگا ہوتا جا رہا ہے اور اس نے محض تہواروں کی عیاشی کا نام مذہب رکھ لیا۔

بابورام کنور بہت دیر تک معلوم نہیں کیا کیا سوچتے رہے اور جب پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو قدم خود بہ خود مسجد کی طرف اٹھ گئے کہ دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ مسجد سے حسرت اور ویرانی ٹپک رہی تھی، کچی دیواریں نونی زدہ، جا بہ جا ڈھئی اور پھٹی ہوئی، چھپر جہاں تہاں سے خراب وخستہ، کھپڑے کہیں کھڑکے ہوئے، کہیں ٹوٹے ہوئے۔ اندراولتی پر بارش کا پانی چونے سے لکیروں کے ابھرے ہوئے نشانات۔ کئی دن سے جھاڑو نہ پڑنے سے ہر طرف دھول اٹی ہوئی۔ مٹی کے گھڑے پر گرد کی موٹی تہہ بیٹھی ہوئی۔ مٹی کی دو تین بدھنیاں الگ الگ لڑھکی ہوئیں اور انگنائی میں مرغیاں چگتی ہوئیں اور ایک دو جگہ مرغیوں کی غلاظت چپکی ہوئی۔

ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ بابورام کنور کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا جیسے کچھ سوجھ گیا ہو، یا سوچ رکھا ہو۔ اندر ایک چمک سی ہوئی، جس کی دمک ان کے ہونٹوں پر بھی جھلملا گئی۔ ایک شانت آتما کے ساتھ وہاں سے میاں جی کے گھر کی سمت ان کے قدم بڑھے ہی تھے کہ مبارک علی کا کارندہ سلیم تیزی سے لپکتا ہوا ادھر آ نکلا۔

بابورام کنور یوں ہی پوچھ بیٹھے ''اتنی تیزی میں کہاں لپک رہے ہو؟''

سلیم نے کہا ''بابو صاحب کے کام سے جا رہا ہوں، باہر مہمانوں کے لیے سپٹک پاخانہ بن رہا ہے، اسی کے لیے اینٹیں لانے جا رہا ہوں۔''

بابورام کنور کو دھچکا لگا، مسجد پر ایک اچٹتی سی نگاہ اٹھ گئی اور انھوں نے پوچھا ''ارے بھائی، وہ میاں جی ابھی اچھے نہیں ہوئے کیا؟''

سلیم بول اٹھا ''ارے ہاں یاد آیا، وہ تو آپ سے ملنا چاہتے ہیں، حالت اچھی نہیں ہے، بے چارے کے پیٹ میں کچھ ہوگیا ہے، بہت تکلیف ہے، بوڑھے بھی بہت ہیں، امید کم ہے۔''

اور پھر سلیم بیڑی کے کش لیتا ہوا آگے بڑھ گیا، تب دو تین منٹ بعد ہی بابورام کنور میاں جی کے جھونپڑے میں جا پہنچے۔ ان کو دیکھتے ہی میاں جی کی ضعیفہ بلبلا اٹھیں، وہاں اور کوئی نہ تھا، انھوں نے بڑھیا

کی ڈھارس بندھائی ''گھبراؤ نہیں بھابی، میں ابھی ڈاکٹر بلواتا ہوں۔

میاں جی نے پیٹ کے درد کا کرب دباتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے ان کو منع کیا اور دوسرا ہاتھ بیوی کی طرف پھیلا دیا۔ بابو رام کنور بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ بڑھیا نے ایک پوٹلی سے نوٹوں کی گڈی نکال کر میاں جی کے ہاتھ میں دے دی۔ انھوں نے گڈی بابو رام کنور کو تھماتے ہوئے نہایت نحیف آواز میں کہا: ''کنور جی، گن لیجئے اپنی امانت۔ چار ہزار۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔ مسجد ۔۔۔۔۔۔۔ مسجد ۔۔۔۔۔۔۔'' میاں جی کی زبان لڑکھڑا گئی، پھر سنبھل کر بولے'' آپ یہ نیک کام کسی اور سے کرا دیجئے۔''

بابو رام کنور نے آبدیدہ ہو کر پوچھا'' میاں جی، آپ ہی کوئی اچھا آدمی بتا دیجئے۔''

میاں جی کی زبان سے نکل پڑا'' بابو رام کنور۔''

اور اس کے ساتھ ہی میاں جی کے کپکپاتے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے اور آندھیوں کی زد پہ جلنے والے چراغ کی لَو کچھ اور کپکپانے لگی۔

*

چہرے کی تلاش

میں آدمی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ کائنات کا پہلا آدمی۔

نہ جانے کتنے کروڑوں سال گذرے، جب میں وجود میں آیا تھا۔ آج میں اپنے وجود کے کھنڈروں سے نکل کر اپنے آپ کو ڈھونڈنے نکلا ہوں، جب میں وجود میں آیا تو سب کچھ ناپید تھا، اس میں زندگی نہیں تھی۔ کائنات کے ہر ذرے نے مجھ سے زندگی، صورت اور حرکت پائی۔ آج دیکھتا ہوں کہ سب کچھ موجود، زندہ اور متحرک ہے، میں ہی کہیں نظر نہیں آتا۔ میری علامات اور نشانیاں تو ادھر ادھر بکھری دکھائی دے رہی ہیں؛ لیکن میں اپنے آپ کو کہیں نہیں پا رہا ہوں۔ ذرا اپنے آپ کو تلاش کر کے تو دیکھوں، کہیں میں مر تو نہیں گیا! ہاں میں اپنے آپ کو چھو نہیں پا رہا محسوس نہیں کر پا رہا۔ شاید مر ہی چکا ہوں۔ دیکھوں اپنے آپ کو پا لوں تو پھر سے جینا شروع کر دوں؛ کیوں کہ جینے کی لذت مرنے کے بعد

بھی مجھے یاد ہے۔ اس لذت کی یاد آج بھی مجھے تڑپا رہی ہے۔ کیا واقعی میں مر چکا ہوں؟ لیکن میں مر کیسے سکتا ہوں۔ اگر میں ہی مر جاتا تو ہستی کی نبض کیسے دھڑکتی رہتی! پھر ہستی کی اس بھیڑ بھاڑ، اس چکا چوند میں اپنے آپ کو پا کیوں نہیں رہا ہوں؟ پہچان کیوں نہیں رہا ہوں؟ ۔۔۔۔۔۔۔ نہیں نہیں میں مرا نہیں ہوں۔ یہ رہی میری زندہ لاش۔ مگر اس کا چہرہ کہاں غائب ہے؟

مجھے یاد نہیں کہ میں کب پیدا ہوا تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ جب میں پیدا ہوا تو زمین پر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر شے اندھیرے کی سیاہی میں ڈوبی ہوئی، کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ہر ذرہ جیسے اونگھ رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ خاموش، ساکت اور ڈری سہمی تھی۔ ہر سمت مردنی ہی مردنی تھی۔ کوئی شے متحرک اور متنفس نہیں تھی۔ میں ایک تنہا زندہ اور متحرک آدمی اور اس کے سامنے اتنی بڑی ایک اندھیری، خاموش اور ساکت زمین ۔۔۔۔۔ ایک لاش جس کی آنکھیں کھلی ہوں۔ ایک گرد آلود لاش نہ جانے یہ لاش مجھ سے پہلے کب سے یوں ہی اس حال میں پڑی تھی۔ اس لاش کی کھلی ہوئی بے نور آنکھوں کو شاید میرا ہی انتظار تھا؛ کیوں کہ اس کی آنکھیں میرے ہی وجود پر مرکوز تھیں۔

میں دیدۂ حیراں سے اسی ناپید اکنار اندھیارے میں گھورتا رہا۔ اس زمین کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ خاموشی اور مردنی کا یہ ڈراؤنا سماں مجھے بھایا نہیں۔ اس زمین کو سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ خاموشی اور مردنی کا یہ ڈراؤنا سماں مجھے بھایا نہیں۔ مجھے وحشت ہونے لگی۔ اکتاہٹ اور مایوسی میں جی چاہا کہ کاش وجود سے عدم کی طرف لوٹ جاتا مگر کہاں؟ سر اٹھایا تو اوپر ویسی ہی اندھیری اور سپاٹ ایک چھت نظر آئی ۔۔۔۔۔۔۔ زمین ہی کی طرح لامحدود اور بے کنار، یہ آسمان تھا، نہ جانے آسمان پر کیا تھا۔ میرے سامنے نہ کوئی راستہ تھا، نہ منزل تھی۔ اتنے بھیانک اور بیکراں ماحول میں سانس لینے والا میں تنہا وجود، حیران و پریشان، خائف و ہراساں۔

اپنی ہستی کا راز اور اپنے وجود کا مقصد سمجھنے سے میں قاصر ہو رہا تھا۔ میری سہمی سہمی سانسوں کے علاوہ جمود ہی جمود تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک حبس جیسی قید میں محسوس کر رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا، جیسے میرے اندر کوئی بگولہ امنڈ رہا ہو، قریب تھا کہ اس کرب انگیز عالم میں میری روح پرواز کر جاتی کہ یکا یک میں نے اپنے جسم میں پہلی حرکت محسوس کی۔ کوئی شے لہر کی مانند میرے سینے سے اٹھی اور ویسی ہی ایک دوسری لہر میرے سر کے اندر سے رینگ پڑی۔ دونوں ایک ساتھ دونوں لہریں ایک دوسرے کی طرف لپکیں اور ایک ہو کر میرے رگ و پے میں دوڑ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر گھن گرج

کے ساتھ ایسا کڑکا ہوا کہ کائنات لرز اٹھی، وہ کڑک بجلی میں بھی کہاں ہوگی، پل بھر کے لیے ایسا لگا جیسے میرے وجود کا ذرہ ذرہ بکھر گیا، دوسرے ہی ثانیہ میں جب کہ اس دھماکے کی گونج میرے اندر ختم بھی نہیں ہوئی تھی، میری ہتھیلی پر ایک روشن چراغ تھا۔ اس چراغ سے میرے اردگرد کی فضا منور ہوگئی، ہر شے صاف اور واضح نظر آنے لگی۔ میں بڑے تجسس کے ساتھ اپنے جسم کو بھی دیکھا، چھوا اور ٹٹولا؛ لیکن میں اپنا چہرہ نہ دیکھ پایا، چہرے کو چھو چھو کر، ٹٹول کر محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا، اپنے چہرے کے خدوخال کی ایک جھلک پانے کو میں بے چین ہوگیا، اس کے بغیر میں اپنے آپ کو ادھورا ادھورا محسوس کرر ہا تھا، اپنی ہستی میں ایک خلا سا پا رہا تھا، چہرہ دیکھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کا شدید اضطراب میرے اندر پیدا ہوگیا۔

اس برقی لہر اور دھماکے نے میرے اندر جو سنسنی پیدا کی تھی، وہ ختم ہوچکی تھی۔ چراغ میرے ہاتھ میں جل رہا تھا، نظر تک روشنی ہی روشنی تھی؛ لیکن چراغ کی روشنی زیادہ تھی اور میری نگاہ کم تھی، میری نگاہ کی ایک حد تھی اور روشنی کی کوئی حد نہ تھی؛ اس لیے حدِ نگاہ سے آگے میرے لیے اندھیرا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ چراغ لے کر بڑھوں اور حدِ نگاہ سے بھی آگے چل کر تاریکیوں کو چیرتا ہوا روئے زمین کے گوشے گوشے کو اجالا کردوں؛ تاکہ کوئی شے میری نگاہ سے مخفی نہ رہ جائے۔

میں چراغ لے کر بڑھا تو میرے ساتھ وجود کا سایہ بھی چلا۔ اس سایہ کو میرے ہاتھ کا چراغ بھی روشن کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے بہت چاہا؛ لیکن سائے سے ساتھ نہ چھوٹا۔ اس سائے میں میں نے اپنے چہرے کی ساخت کا مبہم مبہم سا ہیولیٰ دیکھا۔ ابھی اپنے ہی سایہ کو تجسس اور حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے متوازی ایک اور سایہ نظر آیا۔ میرے ہی سایہ جیسا؛ لیکن وہ میں نہیں تھا۔ میں نے بڑھ کر اس نئے سایہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا؛ مگر سایہ غائب۔ میں پھر پیچھے ہٹا تو سایہ موجود۔ اس بار دوسرا سایہ متحرک ہوکر میرے سائے سے متصل ہوگیا اور میں نے اپنے بائیں پہلو میں کوئی شے کلبلاتی محسوس کی۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو میرے ہی جیسا ایک وجود زندہ اور متحرک تھا؛ مگر اس کا سب کچھ میرے وجود سے زیادہ دلکش، نازک اور لطیف تھا۔ وہ سارا حسن جو چراغ کی روشنی میں حدِ نظر تک طرح طرح کی شکلوں میں بکھرا ہوا تھا، وہ اس ایک شے کے اندر سمٹا ہوا تھا۔۔۔۔ وہ ایک شے جو میری ہی جیسی تھی اور میرے پہلو میں شانہ بہ شانہ کھڑی تھی۔ میں اس کا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر وفورِ مسرت سے میرا دل اچھلنے لگا کہ شاید میرا چہرہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

میں حیرت اور تجسس سے اپنے ہم شبیہ وجود کو دیکھتا ہی رہا، اس کو چھو کر دیکھا، ٹٹول کر دیکھا، ہر پہلو سے ہر زاویے سے گھوم گھوم کر دیکھا، وہ شے میری شباہت لیے ہوئے تھی؛ اس لیے میری ساری دلچسپیاں کچھ دیر کے لیے اس پر مرکوز ہوگئیں اور جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عکس تھا، یقیناً میرے چہرے کا عکس تھا، یقیناً میرے چہرے کا عکس۔ وہ میری ہم شبیہ شے بھی میری آنکھوں میں بڑی حیرت سے جھانک رہی تھی، اس کو بھی میری آنکھوں میں اپنے چہرے کا عکس نظر آرہا ہوگا۔ اس طرح ہم دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنا اپنا عکس۔۔۔۔۔۔ اپنا اپنا چہرہ دیکھا۔

اور پہلی بار میرے کانوں نے میری آواز سنی۔۔۔۔۔۔ ''تم کون؟''

''ساتھی۔'' پہلی بار میرے سامعہ نے موسیقی سنی۔۔۔۔۔۔ پہلی بار میں نے ایک آواز سنی، جو میری آواز سے نرم، شیریں اور مترنم تھی۔

''تم کیا ہو؟ کہاں سے آگئیں؟''

''میں تمھاری ہستی کا سایہ ہوں، تمہارے ہی اندر سے آئی، اس چراغ کے ساتھ۔''

تب اس نے میرے پہلو بہ پہلو ہوکر میرا شانہ تھام لیا اور کہا ''آؤ ہم دونوں زمین پر اُجالا پھیلائیں، ابھی آگے بہت اندھیرا ہے، ہم آدمی ہیں، ہمارے لیے تاریکی باعث موت ہے، روشنی زندگی ہے۔''

زندگی اور روشنی کا سفر شروع کرنے سے پہلے میں نے اپنا نام رکھ لیا۔۔۔۔۔۔ مرد اور اس کا بھی ایک نام رکھ دیا۔۔۔۔۔۔ عورت۔

دونوں کا ایک نام نہیں ہوسکتا تھا؛ کیوں کہ دونوں کی پہچان میں کچھ فرق تھا۔ میری طرح ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ دوسری تھی، وہ کچھ اور تھی میں کچھ اور۔ ایک آدمی کے دو روپ ہم دونوں نے مسکراتے ہوئے اوپر نگاہ اٹھائی تو زمین کی چھت ۔۔۔۔۔۔۔ آسمان پر بے شمار ستارے جگمگا اٹھے، اس تخلیق کے تماشے پر ہم دونوں نے قہقہہ لگایا تو فضا ترنم اور موسیقی سے گونج اٹھی اور جب ہمارے لبوں نے ایک دوسرے کو چھوا تو ہر طرف ہر شے پر بہار اور نکھار آگئی۔ سبزہ ہی سبزہ، رنگ ہی رنگ، پھول ہی پھول، پھل ہی پھل، خوشبو ہی خوشبو، ہوا چل پڑی اور زمین سانس لینے لگی۔ ہر شے میں زندگی کی دمک اور نمو کی ہمک آگئی۔

میرے ہاتھ میں چراغ جل رہا تھا۔اس کی روشنی لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میں چل پڑا۔ایک وجود کے دو روپ۔۔۔۔۔۔۔ایک آدمی کے دو پیکر۔آدمی نے یعنی میں نے زمین پر آرائش،افزائش اور آسائش کے لامتناہی منصوبہ کی داغ بیل ڈالی۔

میں روئے زمین پر پھیلنے لگا،میں اپنے جیسے گوشت پوست کے بےشمار پیکروں میں منتقل ہوتا گیا،میری ایک نسل شروع ہوگئی،زمین پر اپنا تسلط اور تصرف بڑھاتے بڑھاتے میں لاکھوں کروڑوں پیکروں میں حلول کر گیا،آدمی کی یعنی اپنی نسل کا نام میں نے انسان رکھا۔باقی موجودات کو میں نے حیوانات،نباتات اور جمادات کے خانوں میں تقسیم کیا۔خود کو اشرف المخلوقات پا کر میں نے کائنات کو مسخر اور تابع کیا،میرے نقش قدم زمین کے چپہ چپہ پر پڑتے گئے،میں لاکھوں کروڑوں میں تقسیم ہوکر روئے زمین پر حکمرانی کرنے لگا،میں نے اپنے کتنے روپ کتنے بھیس بدلے؛لیکن اندر ہی اندر میں ایک رہا،ایک۔۔۔۔یعنی آدمی یا انسان۔وہ چراغ ہمیشہ میرے ہاتھ میں جلتا رہا۔اس کی روشنی بڑھتی رہی۔اس روشنی سے میں نے سب کچھ پالیا۔زمین کی چھاتی پر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔آگ اور پانی کو بھی تابع کیا۔جنگلوں کو سر کیا اور پہاڑوں کے سینے کو چیرا۔خطرات کے مقابلے کئے۔دشمنوں سے مدافعت کے طریقے ایجاد کئے۔کس کس جتن سے زمین کو سنوارا اس کے گوشے گوشے کو سجایا،اس کے نظاروں کو نکھارا،قدم قدم پر دشمنوں اور حریفوں کو پچھاڑا۔آفاتِ ارضی وسماوی نے میرے رنگ برنگ پیکروں کے کتنے ہی کھنڈر بنائے؛لیکن زندگی اور افزائش کے پھول ان کھنڈروں سے بھی کھلتے رہے،میر کارواں ہر رکاوٹ،ہر مزاحمت،ہر طاقت کو زیر وزبر کرتا آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔بڑھتا رہا۔۔۔۔بڑھتا جارہا ہے۔میں نے کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں میری منزل نہ جانے کہاں ہے۔سفر کی ابتدا معلوم ہے،انتہا معلوم نہیں۔یہ سفر یوں جاری رہے گا؛تانکہ اس کی منزل آجائے۔

میں آدمی ہوں۔۔۔۔۔کائنات کا پہلا آدمی،جس کا پرانا پیکر کھنڈر بن چکا ہے اور جو نئے پیکروں میں صدیوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے؛مگر۔۔۔۔۔مگر چہرہ کہاں ہے؟ وہ چہرہ جو میں شفاف پانی اور شفاف آنکھوں کے آئینے میں دیکھتا آیا،کیا ہوا؟ کہاں گیا،میں تو اپنے آپ کو نہایت آراستہ پیراستہ اور سجل،گوشت پوست کا بے چہرہ وجود پارہا ہوں۔میرا چہرہ کیا ہوا،میں اپنے آپ کو کیسے پہچانوں؟ میرا جسم اتنا دلکش اور حسین بن گیا،کتنی اچھی پوشاک چڑھ گئی؛مگر اس کی آرائش وزیبائش کے ساتھ اس خوبصورت دھرتی پر میں بے چہرہ ہوں۔میں ہر سمت نظر دوڑاتا ہوں؛مگر مجھے اپنا وہ چہرہ نہیں مل رہا،جو

میں نے پہلی بار چراغ کی روشنی میں ہمزاد کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ ہائے میرا چہرہ۔

میں نے اپنی زندگی کے لاکھوں کروڑوں سال لمبے سفر میں اپنے چراغ کی روشنی میں زمین کو کیا سے کیا بنا دیا،میں نے گھپ اندھیرے میں جنم لیا اور آج میری روشنی سے زمین سے آسمان تک اُجالا ہی اجالا ہے۔میں نے عالم ہستی کو کیا کچھ نہیں دیا۔آج یہ دنیا غار سے نکل کر چاند تک پہنچ چکی ہے۔آج چراغ کی لو نے اس تیل کو بھی چیلنج کر دیا ہے،جو اس کو روشن کئے ہوا ہے۔اتنی ترقی،اتنی رفعت،اتنی سجاوٹ،اتنی بلندی کہ مجھے خود کہنا پڑ گیا کہ ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

سب کچھ سہی؛لیکن میرا چہرہ کہاں گیا؟ چہرے کے بغیر میرا سارا حسن سارا شباب پھیکا پڑ گیا ہے۔چہرہ ہی میرا آئینہ ہے،میں آپ کو اس آئینے ہی میں دیکھ سکتا ہوں،کیا آئینہ کھو گیا،ٹوٹ گیا،اب اپنے آپ کو کہاں دیکھوں،کہاں پہچانوں؟ کیا یہ جسم میں ہی ہوں،یا کوئی اور ہے؟ کون دیکھے کہ یہ کیسی روشنی ہے جس میں چہرہ نظر نہیں آتا! ہر طرف آرائش ہی آرائش ہے۔پر میرا چہرہ آرائشوں کے انبار میں چھپ گیا ہے،جب چہرہ ہی اوجھل ہے تو میں کس کو سجاؤں۔۔۔۔۔۔اپنے بے چہرہ جسم کو؟

اس دھرتی پر جنم لینے والا اور ایک پیکر سے اربوں کھربوں پیکروں میں منتقل ہوتے رہنے والا میں پہلا آدمی ہوں۔آج میرے پہلے پیکر کے کھنڈروں نے مجھے پکارا ہے اور بتایا ہے کہ میں بے چہرہ پیکروں میں قید ہوتا جارہا ہوں۔آخر اس لمبے سفر میں میرا چہرہ کہاں رہ گیا؟ بے چہرگی کا یہ سفر کس مقام سے شروع ہوا،جہاں واپس جا کر میں اپنا چہرہ پا سکوں؟ آج میں چار دانگ میں اپنے عالم میں اپنے چہرے کی تلاش میں نکلا ہوں۔۔۔۔۔۔اف دھواں بہت ہے۔گرد وغبار بہت ہے۔کچھ سجھائی نہیں دیتا۔میں اپنے چہرے کو آواز دیتا ہوں؛مگر شور وہنگامہ بہت ہے۔کچھ سنائی نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔۔ ارے یہ کیا! میرا چہرہ تو یہاں پڑا ہے۔یہیں میرے ہاتھ کے چراغ تلے۔۔۔۔۔۔ہائے!

ناول کا ایک باب

کٹی ہوئی پتنگ

دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ملک کے طول و عرض میں ہلچل تھی۔ گرانی اور چور بازاری کا دور دورہ تھا۔ عوامی زندگی پر جنگی نظام اور فوجی معاشرے کی پرچھائیں پڑ گئی تھی۔ جنگ کی وجہ سے پیسے کی افراط تھی اور بے روزگاری کا وجود تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ انسان مشینوں کی طرح کام کرنے لگے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں فوجی اڈے قائم ہو چکے تھے۔ امریکی اور برطانوی فوجیوں کی ہر طرف ریل پیل تھی۔ بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ بڑے بڑے تاجروں اور چھوٹے چھوٹے دکانداروں کی بن آئی تھی۔

ایسے میں مسعود ممبئی سے چلا تو کانپور پہنچ گیا۔

چند روز تک تو وہ گرد و غبار اور دھوئیں کے اس گنجان شہر میں آوارہ پھرتا رہا۔ حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس صنعتی شہر میں جنگ کی بڑی گہما گہمی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شہر سے قریب ہی کہیں جنگ ہو رہی تھی۔ یہ شہر شہر نہیں؛ بلکہ فوج کا اڈا بن کر رہ گیا تھا۔ ہر طرف فوجی ٹرکوں اور خاکی وردیوں کے چھلاوے تھے۔ کارخانے دن اور رات چل رہے تھے۔ ہر کارخانہ جنگ کے لیے کام کر رہا تھا۔ درجنوں نئے کارخانے کھل گئے تھے۔ فوجی سپلائی کے بڑے بڑے دفتر اور ڈپو کھل گئے تھے۔ ہر شخص کے لئے کام مہیا ہو گیا تھا بلکہ کام زیادہ تھا اور کام کرنے والے کم تھے۔

مسعود کو ممبئی میں یہ بات نظر نہ آئی تھی۔ وہ کانپور کے ماحول میں کھو کر رہ گیا۔ اسے یہ رونق اور ہلچل بڑی عجیب سی لگی۔ شہر بہت گندہ اور بوسیدہ تھا، پھر بھی فوجی گہما گہمی نے اسے دلچسپ بنا دیا تھا۔ مسعود نے اپنا ڈیرہ وہیں ڈال دیا اور ایک سپلائی ڈپو میں خاصی تنخواہ پر بڑی آسانی سے ملازم ہو گیا۔

کانپور ٹامیوں کا شہر بن چکا تھا۔ اخلاقی قدروں کا زوال اپنے شباب پر تھا۔ پیسے کی فراوانی سے شہر میں شراب اور زناکاری عام ہو چکی تھی۔ تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ طبقے ٹامیوں کے نقش قدم پر چل پڑے تھے۔ خود مسعود بھی اپنے آپ کو ماحول کے اثرات سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ فوجیوں کی صحبت میں رہ کر اس کے کردار میں بھی سفلہ پن پیدا ہو گیا۔ اس کے اندر مدت سے ایک پیاس سلگ رہی تھی۔ اپنی

دیرینہ حسرتوں کی تسکین کے لیے وہ نئی نئی عادتوں کا شکار ہو گیا۔ اس پر ایک عجیب خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں سے بے نیاز ہو کر حال کی سستی رنگینوں میں غرق ہو گیا۔

نئے ماحول میں اس کو ایک نیا دوست مل گیا، جو اس کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ بن گیا۔ سارا دن تو وہ دونوں دفتر کی چہار دیواری میں قید رہتے اور شام سے آدھی رات گئے تک شراب اور عورت کی قربت سے غم ہستی کا علاج کیا کرتے۔ یہ ان دونوں کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔

اس کے نئے دوست کا نام حبیب تھا، جو بڑا بے فکر اور موجی تھا۔ ایک تو خوش حال گھرانے کا چشم و چراغ۔ اس پر تنخواہ اور اوپر کی آمدنی کافی تھی اور وہ ساری کمائی کو شراب اور عورت پر پانی کی طرح بہا دیا کرتا تھا؛ مگر مسعود نے ایسے ماحول میں رہ کر بھی اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ خاطر خواہ طور پر اپنے والدین کی مدد نہیں کر پاتا تھا۔

حبیب دوست کم اور یار باش زیادہ تھا۔ عاشق مزاجی اس کے کردار کا طرۂ امتیاز تھی۔ اس کے پاس ان عورتوں کی ایک فہرست تھی، جن پر وہ عاشق تھا۔ یہ عورتیں صرف دو شہروں میں پائی جاتی تھیں: کانپور اور لکھنؤ، اتوار کی اکثر راتیں وہ دونوں لکھنؤ پہنچ کر بسر کیا کرتے۔

نئی صحبتوں میں مسعود نے سب سے پہلے شراب نوشی سیکھی، اس کے بعد وہ مختلف عمر اور مختلف طبقوں کی عیاش عورتوں میں کشش محسوس کرنے لگا، جنگ نے آوارہ مزاج اور ''خود کفیل'' عورتوں کی تعداد بہت بڑھا دی تھی اور ان سب کی فیاضانہ سرپرستی امریکی اور برطانوی فوجیوں کی طرف سے ہوتی تھی اور ان کی سرپرستی میں جو کسر رہ جاتی تھی، اسے جنگ کی پیداوار ''ہندوستانی'' ٹامی پوری کیا کرتے تھے۔

مسعود کی دیرینہ تشنہ لبی نے ذرا سا جو سہارا پایا تو تکلفات اور ادراک کے سارے تانے بانے توڑ ڈالے۔ کہاں تو وہ بمشکل کسی جوان عورت کی طرف نگاہ اٹھا سکتا تھا اور کہاں یہ کہ بازاری عورتیں بھی اس کی گستاخ اور بے باک نگاہوں سے ذرا دیر کے لیے گھبرا جاتی تھیں۔ اس کے خیالات اور نظریات میں بازاری پن پیدا ہو چکا تھا اور وہ ایک عامیانہ کردار کا آدمی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے ماضی اور حال میں دور کی بھی نسبت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک تو کڑوا کریلا اس پر نیم چڑھا۔

اس کے یار غار حبیب نے کہا ''اگر عورت کو اس کی ساری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ، چاہے وہ جسمانی ہوں، یا جذباتی، بے نقاب دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی دوستی شراب سے کرا دو''۔

مسعود نے کہا ''نہیں۔عورت کی دوستی صرف مرد سے ہوسکتی ہے،اگر اس کو بے حجاب دیکھنا ہوتو ضمیر کی آنکھیں پھوڑ ڈالو''۔

اس کے کردار کی یہ شرمناک کروٹ شاید اس کی یاسیت اور شکست خوردگی کا ردعمل تھی۔اپنے اسی احساس کو شکست دینے کے لیے شاید اس نے فراریت کی یہ راہیں نکالی تھیں۔اس کے خوابوں اور خیالوں میں بسنے والی زمیندار کی وہ سجی سجائی البیلی چلبلی لڑکی مر چکی تھی،البتہ فرحت کبھی کبھی اس کی یادداشت کی گہری تہوں میں کلبلانے لگتی،کبھی کبھی تنہائی کے لمحات میں سوچا کرتا کہ اگر فرحت اسے اس حال میں دیکھ پائے تو؟ وہ اپنے آپ کو ایک اندھیرے غار کی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس کرتا، اسے فرحت کی یاد سے بھی شرم آنے لگی تھی۔اس نے اپنے دماغ کی ساری گزرگاہیں مسدود کر دیں؛ تاکہ فرحت اس کے اندر داخل نہ ہوسکے؛لیکن نہ جانے وہ کون سی سرنگ تھی،جس میں رینگتی ہوئی فرحت اس کے اندر گھس پڑتی اور اس کے ایک ایک گوشے کو ٹٹولنا شروع کر دیتی۔

ایک بار مسعود جھنجھلا اٹھا۔آخر اس فرحت کی بچی کو کیا حق ہے کہ مجھے تنگ کرے،میرے مشاغل میں مخل ہو اور میرے کیرکٹر پر حرف گیری کرے،میں تو اس کی خلوتوں میں جھانک کر کبھی نہیں دیکھتا کہ وہ کیا کر رہی ہے،پھر وہ کون ہوتی ہے میرا تعاقب کرنے والی،وہ میری کوئی نہیں،اب میں اس کو مار ڈالوں گا،اس کو اپنی یادداشت سے حرف غلط کی طرح مٹا ڈالوں گا،تہہ بہ تہہ فراموشی میں اس کو دفن کر دوں گا،ورنہ اس کی یادیں یونہی زندگی میں خلل ڈالتی رہیں گی۔

مگر وہ اپنی تازہ اسفلیت پر زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔باطل ولولوں کے سرد پڑتے ہی اس کے کردار کی اصلیت نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔گھناؤنے اور غیر طبعی مشاغل نے اس کی روح کو نڈھال اور اعصاب کو مضمحل کر دیا تھا۔جھوٹ کے کمزور پڑتے ہی سچ نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔جھوٹ اور سچ کی کشمکش کا یہ عرصہ اس کے لیے سخت آزمائش کا دور ثابت ہوا۔پشیمانی کے احساس سے دل بوجھل رہنے لگا تھا،وہ کچھ دنوں تک اپنے ان فرائض سے بھی غافل رہا تھا،جن کو پورا کرنے کے لیے وہ شہر شہر مارا پھرتا تھا۔گھر والے ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں منی آرڈر کا انتظار کرنے کے عادی ہو چکے تھے؛مگر رنگ رلیوں کی انتہا پسندی میں اس نے تین ماہ تک اس فرض کو بھی پس پشت ڈال دیا۔

شاید وہ اتنی جلدی نہ سنبھلتا؛مگر بے سان وگمان ایک واقعہ ایسا ہوا،جس سے اس کے احساس کو جھٹکا سا لگا اور اس کے جھٹکے نے اس کے اونگھتے ہوئے شعور کو ہوشیار کر دیا اور جب اس نے اپنے

بدلے ہوئے کردار کا جائزہ لیا تو اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی۔ذلت اور پشیمانی کے احساس سے وہ بجھ سا گیا۔

بات یوں ہوئی کہ وہ اتوار منانے کے لیے کانپور سے لکھنؤ گیا ہوا تھا۔شام کے وقت وہ جھومتا ہوا ایک شراب خانے سے نکلا،باہر کی دنیا شراب خانے سے بھی زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔اس کا دوست حبیب اس کے ساتھ نہیں تھا،پھر بھی وہ تنہا نہیں تھا،اس کے ساتھ ایک جوان عورت تھی،شراب خانے کے سامنے ہی فٹ پاتھ پر سگریٹ جلانے کے لیے وہ ٹھٹک گیا۔ابھی اس نے دیا سلائی کی تیلی ہاتھ سے پھینکی بھی نہ تھی کہ ایک تانگہ سامنے سے اس کے پاس رکا اور ایک برقعہ پوش عورت تانگے سے اس کے قریب آگئی۔

''آداب عرض کرتی ہوں''

''جی کیا آپ مجھ سے کچھ'' مسعود کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں،جی ہاں آپ ہی سے۔کیا آپ مسعود صاحب نہیں؟'' عورت اپنی آواز سے جوان معلوم ہو رہی تھی اور بڑی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔

''معاف کیجئے گا،میں نے آپ کو پہچانا نہیں،کچھ یاد نہیں آرہا ہے کہ'' وہ اپنی یادداشت پر زور دینے لگا۔

''اچھا ذرا آپ مجھے پہچانئے تو جانیں''۔عورت زیرنقاب ہنس پڑی۔

''آپ کون ہوسکتی ہیں؟ کچھ یاد نہیں آتا''۔وہ اپنے آپ بڑبڑایا۔

برقعہ پوش خاتون نے اپنی سیاہ نقاب الٹ دی۔

مسعود کچھ ایسا چونکا کہ اس کے ہاتھ کی سگریٹ زمین پر گر گئی۔اس کے سامنے عورت کا چہرہ نہیں؛بلکہ چودھویں کا چاند تھا۔اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''ارے نعیمہ تم!تم یہاں کیسے؟''

''یس سر''۔

''مگر تم ایک دم سے اتنی بڑی کیسے ہوگئیں!اتنی موٹی تازی کیسے ہوگئیں!
تم تو کیسی دھان پان.................''

''مسعود صاحب آپ تو پانچ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں۔پانچ سال میں تو کیا سے کیا ہوجاتا ہے''۔

''مثلاً کیا کیا ہوا؟''

نعیمہ بولی'' فی الحال تو صرف تین باتیں بتاسکتی ہوں ، میں نے میٹرک پاس کیا، میں نے بی۔اے پاس کیا، میری شادی ہوگئی''۔

''شادی بھی ہوگئی!''مسعود جیسے حیران رہ گیا۔

''جی ہاں اور کیا''۔نعیمہ نے فخر اور مسرت کے لہجے میں کہا۔

''کب؟ کہاں؟''

''یہیں لکھنؤ میں۔دو مہینے گزرے''۔

اب مسعود کی نگاہ تانگے کی طرف اٹھی، جس میں ایک خوبصورت نوجوان مسکرا رہا تھا۔مسعود کو اچانک کچھ یاد آیا اور اس نے پلٹ کر شراب خانے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ابھی تک وہ عورت باہر نہیں نکلی تھی، جو مسعود کے ساتھ تھی، وہ کسی کام سے اندر رک گئی تھی۔

نعیمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا'' آیئے میں آپ کو اپنے ہسبینڈ (Husband) سے ملاؤں۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں''۔

مسعود تانگے کی طرف بڑھا۔

نعیمہ نے دونوں کا تعارف کرانے کے بعد کہا''مسعود صاحب آپ کی تینوں مٹھائیاں ادھار ہیں، جب کہیئے حاضر ہوں، آیئے تانگے پر بیٹھئے گھر چلیں، آپ سے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں، بہت کچھ پوچھنا ہے''۔

''تم اپنا پتہ دے دو، پھر کبھی مل لوں گا''۔

اتنے میں وہ عورت شراب خانے سے نکلی اور مسعود کے پہلو میں جا کر کھڑی ہوگئی۔نعیمہ نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔شراب کے نشے میں عورت کا چہرہ تمتایا ہوا تھا، آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں، اس نے نعیمہ اور اس کے شوہر کی طرف التفات کیے بغیر مسعود کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا'' آؤ چلیں۔دیر ہو رہی ہے۔

پھر ہمیں پکچر بھی چلنا ہے۔''

نعیمہ کی زبان سے تو کچھ نہ نکلا؛ مگر اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔

''یہ عورت کون ہے؟''

مسعود شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا، اس عورت کے ہر نقش اور ہر انداز پر بازاری پن کی چھاپ پڑی ہوئی تھی۔نعیمہ ایک نظر مسعود کو اور ایک نظر اس عورت کو دیکھے جا رہی تھی، پھر مسعود نے اس کی آنکھوں میں شک کی جھلک دیکھی'' کہیں یہ عورت آپ کی بیوی تو نہیں؟''

مسعود نے اپنی خجالت اور جھینپ مٹانے کے لیے کہا'' یہ میری ایک دوست ہیں، اچانک ملاقات ہوگئی ہے''۔

نعیمہ کچھ کہے بغیر تانگے میں بیٹھ گئی؛ مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں'' گویا آپ شراب خانوں میں بازاری عورتوں سے دوستی کرتے پھرتے ہیں! میں نے آپ کو ایسا نہ جانا تھا''۔

نعیمہ نے چہرے کی نقاب ڈھلکا دی اور تانگہ جاتا رہا۔

اور جب تانگہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو مسعود نے عورت کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔اس کا جی چاہا کہ عورت کے چہرے پر تھوک دے؛ مگر اس نے صرف اتنا کیا کہ جیب سے کچھ روپے نکال کر عورت کے ہاتھ پر دھر دیئے اور خود سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر چلا گیا۔

اس روز پہلی بار اس کو اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی، وہ لکھنؤ سے کانپور تک یہی سوچتا رہا کہ نعیمہ نے کیا سوچا ہوگا، کیا سمجھا ہوگا؟ گو زبان سے تو وہ کچھ نہ بولی تھی؛ مگر اس کی آنکھوں کے تیور اور چہرے کے تاثرات نے سب کچھ بتا دیا تھا۔اس نے مسعود کو ایک نیچ اور بازاری آدمی سمجھا۔وہ پچھتائی ہوگی کہ کیوں ایک ایسے پست آدمی سے سرِ راہ اس قدر خلوص اور تپاک سے ملی؛ کیوں اس نے اپنے شوہر سے اس کا تعارف کرا دیا۔اس کے شوہر نے بھی کیا سمجھا ہوگا کہ ایسا بازاری آدمی اس کی بیوی کا ٹیوٹر رہا ہے۔کیا عجب کہ وہ اپنی بیوی کے چلن پر بھی شک کر بیٹھا ہو؟ نعیمہ کی طرف سے نفرت و حقارت کا اس سے زیادہ اور کیا اظہار ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے مکان کا پتہ بتائے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

اس پر اپنے آپ سے نفرت اور اپنے کیے پر پشیمانی کا اتنا شدید دورہ پڑا کہ اگر اس کا شعور ذرا سنبھالا نہ لیتا تو وہ خودکشی بھی کر گزرتا۔وہ بہت اداس اور کھویا کھویا رہنے لگا۔فرصت کے اوقات میں وہ اکثر تنہا اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔نئے ماحول میں آ کر ادب سے بھی اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی اور اس نے افسانہ نویسی بھی ترک کر رکھی تھی۔طبیعت کی بے چینی کچھ کم ہوئی تو اس کا ادبی ذوق پھر نئی توانائی کے ساتھ زندہ ہونے لگا، اس نے اپنی فائلوں کے گرد کو جھاڑا اور اپنے غیر مطبوعہ مسودوں پر نظر ثانی کرنے لگا، اس شغل میں اس کو بڑی تسکین محسوس ہوئی۔

اس کی بدلی ہوئی کیفیت دیکھ کر حبیب حیران تھا، اس نے مسعود کو بہت کچھ ٹٹولا؛ مگر وہ کھلتا ہی نہ تھا۔ آخر ایک دن وہ مسعود کے پیچھے پڑ گیا، کہنے لگا ''جناب افسانہ نگار صاحب کچھ منہ سے پھوٹئے تو سہی کہ آپ کو ہوا کیا ہے؟ آخر ہم آپ کے غلام کس کام آئیں گے؟''

مسعود خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

حبیب کہتا رہا ''کیوں یار کہیں دل لگا بیٹھے ہو کیا؟ مگر یہ تو خوشی کی بات ہے، اس طرح ماتمی صورت بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر کچھ کہو تو، تمہاری یہ خاموشی اور سنجیدگی واللہ بہت کھل رہی ہے''۔

''میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ کوئی بات نہیں ہے، بس ذرا موڈ بدل گیا ہے، یہاں کچھ اکتاہٹ سی ہونے لگی ہے''۔

''ارے کیوں بیوقوف بنا رہے ہو، موڈ بھی کہیں اس طرح بدلا کرتا ہے، وہ تو گھڑی دو گھڑی کی بات ہوتی ہے، اس کے بعد طبیعت پھر موج میں آجاتی ہے''۔ حبیب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا ''تم جس دن سے لکھنؤ سے واپس آئے ہو، اسی دن سے تمہاری حالت غیر ہو رہی ہے، ضرور لکھنؤ ہی میں کچھ ہوا ہے، کم بخت لکھنؤ جگہ ہی کچھ ایسی ہے۔ کوئی حادثہ ہوا ہے؟''

''حادثہ'' کے لفظ پر مسعود کچھ کسمسایا، ہاں وہ حادثہ ہی تو تھا۔ بہت بڑا حادثہ!

مسعود نے کہا ''ہاں ایک حادثہ ہی ہوا ہے''۔

''اب آئے سیدھے راستے پر، تبھی کئی روز سے اندر ہی اندر گھٹ رہے ہو؛ مگر ذرا سنیں تو کہ وہ حادثہ کیا ہے اور ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں''۔

''کیا کرو گے سن کر جو کچھ ہو چکا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں۔''

''یار مسعود تم بڑے سڑیل آدمی ہو، میں وہ بات پوچھ رہا ہوں، جو ہوئی ہے اور تم فلمی ڈائیلاگ بول رہے ہو، اگر دنیا میں جینا ہے تو دوا اور دو چار بن کے رہو۔ صاف صاف بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟''

چند منٹ کے توقف کے بعد مسعود نے کہا ''ہوا یہ ہے کہ ایک بہت اونچی اور بہت شریف لڑکی نے مجھے لکھنؤ کی سڑک پر بازاری عورت کے ساتھ دیکھ لیا ہے اور کچھ ایسے عالم میں دیکھا کہ میری ساری عزت مٹی میں مل گئی، اس لڑکی کی نظر میں میری بڑی عزت تھی، وہ میرے کردار کی بڑی مداح تھی، میں اس لڑکی کو کلکتے میں بہت دنوں تک پڑھاتا رہا ہوں''۔

مسعود نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

حبیب نے میز پر ہاتھ مار کر کہا ''لاحول ولاقوۃ۔ اتنی سی بات تھی، جسے افسانہ کر دیا! جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اگر یہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا اور جب ہو چکا ہے تو اس کا کیا علاج۔ اس لڑکی سے تمہیں کیا لینا ہے۔ وہ اپنے گھر خوش، تم اپنے گھر خوش۔ اس طرح زندگی کو تلخ کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر وہ کنواری ہوتی تو شادی وغیرہ کا چانس بھی تھا۔ تم تو ایک دم سے جذباتی مریض ہو گئے ہو۔ لعنت بھیجو، اس لڑکی پر اور اس حادثے پر، چلو آج کسی چھبیلی جان کا مجرا سنتے ہیں۔ سارا غم غلط ہو جائے گا، ورنہ یوں ہی پڑے سڑتے رہو گے''۔

''اب تم مجھے تنہا چھوڑ دو، تنہائی کے سوا میرا کوئی علاج نہیں''۔

''یہی تو اصل بیماری ہے کہ تم تنہائی چاہتے ہو۔ یہ دراصل احساس کی بیماری ہے اور احساس کی بیماری ہمیشہ بیوقوفوں کو ہوا کرتی ہے، جو اخلاقی نظریات کے سہارے جیا کرتے ہیں''۔ حبیب نے اپنی منطق نکالی ''اگر اس عورت نے تمہیں بازاری عورت کے ساتھ شراب خانے سے نکلتے ہوئے دیکھ ہی لیا تھا، آخر اس میں ذلت اور عیب کی کیا بات ہے، بازاری عورتوں سے ملنا برائی ہے، شراب پینا برائی ہے تو پھر یہ شراب خانے کیوں کھلے ہیں؟ بازاری عورتوں کے محلے کیوں آباد ہیں؟ کیا یہ شراب خانے اور قحبہ خانے کسی دوسری دنیا والوں کے لئے قائم کیے گئے ہیں۔ انہیں تو سماج کی منظوری اور حکومت کی اجازت حاصل ہے؛ یعنی جس بات کو نظریاتی طور پر معیوب سمجھا جاتا ہے، اسی بات کو عملی طور پر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ تم تو بڑے ادیب اور افسانہ نگار بنے پھرتے ہو؛ مگر شاید تم نے عمل اور نظریئے کے اس تضاد پر کبھی غور نہیں کیا ہے۔ سماج اور حکومت کو اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جن کے لیے شراب خانوں اور بازاری عورتوں کی ضرورت ہے۔ بازار میں وہی سودا آتا ہے، جس کے خریدار موجود ہوں۔ کیا ہم انہیں لوگوں میں سے نہیں؟ کیا ہم بھی سماج اور نظام کے پیدا کردہ حالات کا شکار نہیں ہیں، جو اپنی خوشیاں شراب خانوں اور رنڈی کے کوٹھوں پر ڈھونڈتے پھرتے ہیں، جو لوگ اپنی خوشیاں کلبوں، بڑے بڑے ہوٹلوں اور اونچے اونچے محلوں میں حاصل کرتے ہیں، انہوں نے ہمارے ساتھ بھی ناانصافی نہیں کی ہے۔ ہمارے لیے انہوں نے ہماری جیبوں کے وزن کے حساب سے شراب خانے اور رنڈیوں کے کوٹھے قائم کر دیے ہیں۔ اس طرح ہماری چیخ پکار سے ان کے عیش و آرام میں خلل بھی نہیں پڑتا اور ہماری ضرورت بھی پوری ہوتی رہتی ہے۔ کیا وہ لڑکی ان باتوں کو نہیں سمجھتی، جس نے اتنی سی بات پر تمہیں ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا؟ اگر وہ نہیں سمجھتی تو یہ اس کا قصور ہے۔ اس کو تم سے نفرت کرنے کی بجائے ان حالات کی چھان بین کرنی چاہیے، جو تمہیں بازاری عورت سے دلچسپی لینے پر مجبور کیے ہوئے ہیں''۔

حبیب کی تقریر کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

وہ بدستور خاموش رہا، جیسے اس نے حبیب کی منطق پر کوئی دھیان ہی نہ دیا ہو۔ حبیب نے بے چینی سے پوچھا ''کچھ بولو تو سہی۔ میری باتوں سے تمہیں کچھ روشنی ملی، یا نہیں میرے دوست؟ اندھیرے میں بھٹکنا چھوڑ دو''۔

مسعود نے کہا ''منطق اور چیز ہے، احساس اور چیز ہے۔ تم احساس کو منطق کا پابند نہیں کر سکتے۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے؟ اس کا فیصلہ منطق نہیں، احساس کر سکتا ہے۔ میرا احساس؛ یعنی میرا ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ لڑکی تجھ سے نفرت وحقارت کا اظہار کرنے میں حق بجانب تھی، جب خود مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے تو پھر دوسروں سے کیا شکوہ''!

''جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ میں سمجھ رہا ہوں؛ لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ تم نہیں سمجھ رہے ہو، ایک وقت آئے گا، جب میری منطق تمہاری سمجھ میں ضرور آجائے گی اور تم مجھے یاد کیا کرو گے''۔

حبیب نے مایوس ہو کر کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ وہ وقت کبھی نہ آئے''۔

حبیب نے طنز کے لہجے میں کہا ''مگر وقت پر تمہارا قابو نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ وقت تمہاری زندگی میں ضرور آئے گا''۔

''خیر جب آئے گا، تب دیکھا جائے گا، فی الحال تو میں اپنا راستہ بدل کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا ہوں''۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں''۔

''تم کچھ اپنے کردار پر نظر ثانی کر لو تو اچھا ہے''۔

''شاید تمہارے تجربے کے بعد مجھے بھی عبرت ہو جائے''۔

اس واقعہ کے تین ماہ بعد وہ کانپور سے بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

مسعود اپنے گاؤں تقریباً پانچ سال بعد پہنچا تھا۔ اس عرصے میں گاؤں کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسے ہی تھا۔ چھوٹی بہن بیاہی جا چکی تھی۔ بھائی شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ گھر کی مالی حالت ویسی ہی تھی جیسی وہ دیکھ کر گیا تھا۔

اس بار گاؤں پہنچتے ہی والدین نے اس کی شادی کر دی۔ اس دن کو دیکھنے کے لیے اس کی

ماں کب سے بے چین تھی۔ والدین کا یہ آخری فرض تھا، جس سے انہوں نے سبکدوشی حاصل کر لی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ لوگ جتنے غریب ہوتے ہیں، شادی کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں اور اتنی ہی عجلت سے کام لیتے ہیں، ایک عقیدہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ شادی کے بعد قسمت پلٹا کھا جاتی ہے اور برے دن دور ہو جاتے ہیں۔

مسعود کو جو بیوی ملی وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ خوبصورت، نیک اور فرمانبردار تھی، شوہر کو مجازی خدا سمجھتی تھی۔ مسعود کے والدین کے خیال کے مطابق وہ اچھی خاصی تعلیم یافتہ تھی؛ کیوں کہ قرآن شریف ختم کرنے کے علاوہ وہ اردو کی پانچویں تک پڑھی ہوئی تھی۔ امور خانہ داری سے بخوبی واقف تھی؛ مگر یہ بیوی مسعود کی طبیعت کو کچھ جچی نہیں؛ کیوں کہ ساری خوبیوں کے باوجود اس کے اندر کوئی بہت بڑی کمی تھی، اس کمی کو مسعود نے محسوس تو کیا؛ مگر اس کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ شاید یہ کہ خدیجہ اس کی بیوی سر سے پاؤں تک اور اندر سے باہر تک بیوی ہی بیوی تھی، عورت ایکدم نہیں تھی، حالاں کہ مرد کو پہلے عورت چاہیے، اس کے بعد بیوی۔ مرد کے کچھ جذبات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کی پذیرائی صرف عورت ہی کر سکتی ہے؛ لیکن جب مسعود نے خلوت عروسی میں قدم رکھا تو اس نے بیوی کو حاضر اور عورت کو غائب پایا۔

اس زندہ اور متحرک کھلونے سے، جو اسے والدین کی طرف سے ملا تھا، مسعود کا جی اس وقت تک تو خوب بہلا، جب تک خدیجہ کے ہاتھوں کی مہندی نہ چھٹی۔ خدیجہ کی آنکھوں میں جو شادابی اور اس کے ہونٹوں میں جو دوشیزگی تھی، اس کا مسعود کب سے پیاسا تھا؛ اس لیے وہ کچھ دنوں تک اس کمی کو خاطر میں نہ لایا، جو اس نے خدیجہ میں پہلی ہی ملاقات میں محسوس کر لی تھی۔

جب خدیجہ کے ہاتھوں اور پاؤں کی مہندی چھوٹ گئی اور شادی کے ہر جوڑے کو وہ ایک ایک بار استعمال کر چکی تو اس کی مہمانی کے دن ختم ہو گئے اور وہ گھر کے دوسرے افراد کے ڈھنگ پر رہنے سہنے لگی اور مسعود اس کے ساتھ کچھ اس انداز سے گزر بسر کرنے لگا، جیسے وہ اپنا ایک مذہبی، اخلاقی اور سماجی فرض پورا کر رہا ہو۔ شروع کے دو تین مہینوں میں اسے کتابوں سے کم اور خدیجہ سے زیادہ دلچسپی رہنے لگی تھی؛ لیکن اس کے بعد معاملہ برعکس ہو گیا؛ لیکن خدیجہ کو اس تبدیلی کا کوئی واضح احساس نہ تھا۔ خانہ داری میں پھنسنے کے بعد اس کے دماغ کو اتنی فراغت اور فرصت بھی کہاں تھی۔

(''کھوٹا سکّہ''، از: شین مظفر پوری)

انشائیہ

قصہ منشی مرحوم کا

ایک تھے منشی جی؛ بلکہ منشی مرحوم کہیے۔ یہاں مرحوم سے مراد خلد آشیانی وغیرہ نہیں؛ بلکہ کچھ اور ہے؛ یعنی وہ زندہ مرحوم تھے۔ خیر سے مرحوم ان کا نام نہیں؛ بلکہ تخلص تھا۔ تخلص بھی دراصل مرحوم نہیں؛ بلکہ محروم تھا؛ مگر ستم ظریفوں کی عنایت سے ہوتے ہوتے وہ مرحوم ہو گیا، اس طرح منشی جی کو جیتے جی مرحوم کہلانے کی سعادت حاصل ہو گئی اور بقول شیخ سعدیؔ ؎

این سعادت بزورِ بازُو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

منشی مرحوم شاعر تو ضرور تھے؛ مگر ان کا نمونۂ کلام خدا بخش لائبریری میں بھی دستیاب نہیں۔ قاضی عبدالودود سے بھی رجوع کرنے پر بات نہیں بنتی؛ کیوں کہ منشی مرحوم ماشاء اللہ ان خوش نصیب شاعروں میں تھے، جن کا محض تخلص ہوا کرتا ہے۔ کلام وغیرہ کے جھمیلے میں پڑنا وہ تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ ٹھیک بھی ہے؛ کیوں کہ جب ہلدی پھٹکری لگائے بغیر ہی رنگ چوکھا آتا تو شعر کہہ کر مشاعروں میں سامعین اور رسالوں میں بے رحم نقاد حضرات کا تختۂ مشق بننے کی حماقت کوئی کیوں کرے۔ اگر منشی مرحوم موصوف نے کبھی بھولے بھٹکے کوئی مصرعہ موزوں بھی کیا ہو تو اس کا حال، یا تو عالم الغیب کو معلوم رہا ہو، یا منشی جی کی اہلیہ عرف منشیائن کو، کوئی تیسرا اس راز کا امین نہیں تھا؛ لیکن منشیائن تو ان کے اس عظیم الشان تخلص ہی سے جلی بھنی رہتی تھیں، وہ بھلا منشی جی کے شعر وغیرہ کی تاب کہاں سے لاتیں۔ ویسے ریسرچ کے شوقینوں نے اس سلسلے میں منشیائن سے بھی رجوع کرنے کی ہمت کر کے دیکھا؛ مگر منشیائن نے بھی خدا رسول کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ اگر کبھی کوئی شعر حادثاتاً بھی منشی مرحوم سے سرزد ہوا تو وہ باہر ہی ہوا ہوگا، چہار دیواری کی حدود میں یہ سانحہ کبھی نہ گذرا، یوں بھی چہار دیواری کی حدود چولہے چکی والی شریف خانہ دار بیبیوں کی قلمرو ہوتی ہیں، جہاں شاعری کی نحوست کے لیے دفعہ چوالیس ہی ہوتی ہے۔ غرض منشیائن موصوفہ نے اپنے مشہور و معروف خاوند منشی مرحوم کے ایک لنگڑے لولے مصرعے تک کی بھی گواہی نہ دی۔ حد تو یہ ہے کہ خود منشی جی بھی اپنی تاریخی شخصیت کے اس نازک اور لطیف گوشہ پر روشنی ڈالنے

سے قاصر تھے۔ وزیر بے قلمدان کی طرح منشی مرحوم کب شاعر بے کلام بنے، کب ان کا تخلص پڑا اور کس طرح وہ محروم سے مرحوم ہو گئے، یہ سب خود ان کو بھی یاد نہیں رہ گیا تھا۔ صرف ایک بات کی ہلکی ہلکی یاد باقی تھی؛ یعنی وہ مبارک دن جب وہ موسوم سے متخلص ہو گئے تھے۔ کسی مشاعرے سے رات گئے لوٹے تو منشیائن کو جگا کر خوش خبری سنائی ''بی بی'' آج سے میرا تخلص ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ''مرحوم'' اور منشیائن نے برا سا منہ بنا کر گویا غراتے ہوئے یوں نوازا تھا ''تم اپنا نام خرافات وغیرہ بھی رکھ لو تو اس سے مجھے کیا۔ میرے لیے تو تم شروع سے جو ہو سو ہو'' اور جب منشی جی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ''کیا یہ تخلص تمھیں پسند نہیں آیا؟'' تو منشیائن نے پہلے سے بھی زیادہ برا منہ بنا کر حوصلہ شکنی کی ''ٹھیک ہی ہے، اب تم واقعی اسم بامسمیٰ ہو گئے، لاحول ولاقوۃ'' اور منشی جی اپنی اوقات پہچان گئے''۔

گویا بے چارے منشی جی شاعر نہیں؛ بلکہ شیطان تھے۔ منشی جی کا آدھا دل تو اسی وقت ٹوٹ کر رہ گیا؛ مگر کرتے کیا، تخلص پڑ چکا تھا، مجبوری تھی، اب تخلص کو ترک کرنا ایسا ہی تھا، جیسے کوئی پدم شری، پدم بھوشن وغیرہ کا خطاب گھر آ کر واپس کرنا چاہے، منشی جی کو تخلص کی لاج رکھنی ہی تھی۔ بیوی کی طرح تخلص کو بھی ہر قیمت پر نبھانا تھا۔ آدھا دل جو ٹوٹنے سے بچ گیا تھا، اسی میں منشی مرحوم نے اپنے تخلص کو جگہ دے دی اور محض ''منشی جی'' کی بجائے ''منشی محروم'' کہلانے کی لذت و مسرت کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے لگے؛ مگر بیوی کبھی جھوٹوں بھی ان کا تخلص زبان پر نہ لائی؛ بلکہ چڑنے لگی، پھر جس طرح کچے گلابی رنگ کا کپڑا دھلتے دھلتے سفید ہو جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا، اسی طرح ہوتے ہوتے ''محروم'' کس طرح ''مرحوم'' ہو کر رہ گیا، منشی جی کو محسوس بھی نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ اور اس کے بعد منشی جی کی اپنی یادداشت بھی کام نہیں کرتی تھی۔

ویسے منشی مرحوم کے ذہن سے اپنا اوریجنل نام بھی گویا محو ہو چکا تھا، جیسے پیدائشی مرحوم واقع ہوئے ہوں، کبھی ضرورت ناگہانی میں اصلی نام جلدی سے یاد نہ آتا تو بیوی سے رجوع کرتے۔ بیوی نے بہر حال ان کا اصلی پورا نام ازبر کر رکھا تھا، جو بڑا ثقیل اور پیچیدہ تھا؛ کیوں کہ نام بھول جانے سے نکاح اور زوجیت میں خلل کا اندیشہ ہو سکتا تھا، گرچہ موقع پڑنے پر منشی جی بیوی کی زوجیت اور بچوں کی ولدیت میں بھی اپنا نام منشی مرحوم ہی لکھوانے کی کوشش کیا کرتے؛ مگر منشیائن ان کو جھاڑ دیا کرتیں کہ ان کا نکاح کسی مرحوم سے نہیں ہوا تھا جو ان کا خاوند اور ان کے بچوں کا باپ کہلائے۔

قصہ کوتاہ، منشی مرحوم اپنی دلچسپ خصوصیات کی وجہ سے نئی روشنی کے زندہ دلوں میں عجیب

الخلقت شمار ہوتے تھے اور لوگ انہیں فرصت اور فراغت کے لمحوں میں بطور مفرح القلوب استعمال کرتے تھے۔ ویسے منشی مرحوم رہن سہن سے آدمی بڑے نستعلیق اور طور اطوار سے سیدھے سادے تھے۔

اپنے اوریجنل تخلص مرحوم کی مناسبت سے کوئی اور محرومی ان کو رہی ہو یا نہ رہی ہو؛ مگر ایک محرومی زبردست تھی؛ یعنی اندرونی صحت سے محرومی۔ ویسے دیکھنے میں تو اچھے خاصے چلتے پھرتے کھاتے پیتے آدمی تھے؛ اس لیے ان کے مرض کا کوئی فیس ویلو نہیں تھا، پھر منشیائن کسی علامت ظاہری کے بغیر ان کو مریض کیسے تسلیم کرلیتیں۔ بیوی کو بھلے ہی اعتبار نہ آئے؛ مگر منشی مرحوم اندر سے دائم المریض؛ بلکہ مجموعۂ امراض تھے۔ کوئی ایک مرض ہو تو نام لیا جائے۔ الحمدللہ، کوئی بھاری، یا مہلک مرض ان کو یقیناً نہیں تھا؛ مگر رائج الوقت یعنی چالو بیماریاں تقریباً سب کی سب ان کے اندر موجود تھیں، جو باری باری ان کو تنگ کیا کرتیں، مثلاً کبھی نزلہ زکام تو کبھی کبھی کف اور کھانسی، کبھی قبض تو کبھی دست، کبھی بدہضمی تو کبھی پیچش، کبھی سر میں درد تو کبھی پیٹ میں مروڑ، کبھی یہ تو کبھی وہ۔ غرض ایک نہ ایک آزار جان ناتواں کو لگا ہی رہتا؛ مگر منشی مرحوم ان موذی بیماریوں سے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ کبھی کسی دوا کا مرہون منت ہونا گوارا نہ کیا، بیمار پڑنا اور خود بخود اچھا ہو جانا، گویا ان کا روزمرہ کا مشغلہ بن کر رہ گیا تھا۔

منشی مرحوم کو ایک اور بیماری بھی تھی، ایک اسپیشل؛ بلکہ فرمائشی بیماری، اس بیماری کا نام تھا بیوی عرف منشیائن، جس دن منشی جی کو دیگر امراض سے فراغت رہتی، اس دن ان کو بیوی کا عارضہ لاحق ہو جاتا؛ یعنی جب نیک بخت منشیائن دیکھتیں کہ آج کا دن خیر سے خالی جا رہا ہے تو وہ چڑ کر منشی جی کے سر ہو جاتیں کہ ایک دن کے لیے بھی طبیعت ٹھیک رہے ہی کیوں؟ وہ منحوس ایک مبارک دن آئے ہی کیوں؟ منشیائن ان کی جان کو روگ بن کر چمٹ جاتیں۔ دھاردار زبان سے وہ وہ سیدھا وار کرتیں کہ طبیعت کا صاف ہونا تو کیا نزلہ تک صاف ہو جائے؛ اس لیے اگر کسی دن نصیب دشمناں منشی مرحوم کی طبیعت اتفاقاً ٹھیک بھی رہتی تو بیوی کے طعن و تشنیع کے خوف سے اس راز کو چھپائے رہتے۔ کسی نہ کسی خرابی کا بہانہ گڑھ لیتے؛ مگر جب باہر کوئی مزاج پرسی کرتا تو چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیتے ''میاں آج اللہ کا فضل ہے۔ آج بس بیوی صاحبہ کا عارضہ ستائے ہوئے ہے''۔ گویا منشی مرحوم کے امراض کی فہرست میں ایک مرض کا نام بیوی بھی تھا۔ اگر یہ بھیانک بات منشیائن کو معلوم ہو جاتی تو گھر میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی۔

یہ تو ہوا منشی جی کا سرسری تعارف، قصہ کچھ اور ہے۔ قصہ یوں تھا کہ وہ سارے زمانے کا درد اپنے سینے میں لیے پھرتے تھے۔ وہ مجروح سینہ جو منشیائن موصوفہ کے تیروں سے پہلے ہی چھلنی بنا ہوا

تھا؛ مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس زمانے کے لیے درد ہی درد تھا، دوا نہ تھی۔ تخلص رکھنے کے باوجود اپنا کوئی شعر تو پبلک کو سنایا نہیں (بقول شخصے کہ اپنے اشعار انہوں نے میدان محشر کے لیے محفوظ رکھے تھے) البتہ دوسروں کے دو اشعار وقتاً فوقتاً، یا موقع بے موقع پڑھا کرتے تھے۔ کوئی تیسرا شعر کبھی کسی نے ان سے سنا ہی نہیں، ان دونوں میں سے ایک شعر امیرؔ مینائی کا تھا اور دوسرا اکبر الہ آبادی کا۔

جب کوئی ایسی بات دنیا میں ہوتی، جس کی تکلیف تو وہ محسوس کرتے؛ مگر اس کی چارہ گری سے اپنے کو قاصر پاتے تو یہ شعر پڑھا کرتے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اور جب کوئی ایسا واقعہ ہوتا، جس سے پبلک کی بے حسی کا اظہار ہوتا تو یوں کہا کرتے ؎

بے خبر ہوکر رہو تو شکوۂ حالیؔ سنو
با خبر ہوکر رہو تو قوم کی گالی سنو

یہ شعر منشی مرحوم کبھی کبھی بیوی سے نوک جھونک ہونے پر بھی پڑھا کرتے؛ کیوں کہ بے خبر رہ کر شکوۂ حالیؔ سننا ان کو گوارہ نہ تھا؛ مگر باخبر رہ کر قوم کی گالی سننا ان کو منظور تھا اور خیر سے وہ اپنی بیوی یعنی منشیائن بالقابہ کو ہی پوری کی پوری قوم تصور کرتے تھے؛ کیوں کہ قوم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ منشی مرحوم کو گالیاں دیتی پھرے۔

منشی مرحوم کو دراصل جو سب سے خطرناک مرض تھا، اس کا ذکر تو آیا ہی نہیں، جب کہ وہی سارے ماجرے کی جڑ ہے۔ اسی مرض کے سبب وہ سارے زمانے کا درد اپنے سینے میں لیے پھرتے تھے اور اسی ام الامراض نے ان کو قے، دست، پیچش، اپھار، دردسر، درد جگر، اعضا شکنی اور اختلاج وغیرہ میں بھی مبتلا کر رکھا تھا، اس مرض کا نام تھا ''اخبار بینی''؛ مگر اس مرض کا تشخیص کرنے والا کوئی نہ تھا، اگر افلاطون اور لقمان بھی زندہ ہوتے تو اس مرض تک نہ پہنچ پاتے؛ کیوں کہ یہ ایسا پوشیدہ اور پُر اسرار مرض ہے، جس کی تشخیص کوئی دوسرا مریض ہی کر سکتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئی۔

ہاں تو منشی مرحوم کو اخبار کا کیڑا بھی کہا جا سکتا تھا؛ کیوں کہ وہ اخبار پڑھتے نہیں؛ بلکہ چاٹتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا منشی مرحوم اخبار ہی پڑھنے کو پیدا ہوئے ہوں۔ ہوتا یوں ہے کہ عام

طور پر لوگ کچھ لوگ: بلکہ کوئی کوئی آدمی موقع مل جانے پر کسی اخبار کی موٹی موٹی سرخیوں پر سرسری سی نظر ڈال لیتا ہے اور اپنے رادھے کو یاد کرتا ہے، جس کو اتنی بھی فرصت نہ ہو، وہ کسی اخبار پڑھنے والے ہی سے خاص خاص خبروں کا خلاصہ پوچھ لیتا ہے، مگر منشی مرحوم ان ادھ کچرے اخبار بینوں میں نہ تھے، وہ جس اخبار کو اٹھاتے، اس کے اشتہارات تک کو چاٹ جاتے، اس پر بھی ایک اخبار پڑھنے سے تو ان کی سیری ہوتی نہ تھی۔ شہر کے اخباروں کے علاوہ باہر سے آنے والے اخباروں کی بھی تاک میں لگے رہتے، کوئی پرانا اخبار مل جاتا تو اس کو بھی بڑے خشوع خضوع سے پڑھتے۔ صبح سے سہ پہر تک تو ان کے مطالعہ کا سیشن چلتا اور جب سب اخبارات چر چگ لیتے، تب جگالی کا دور شروع ہوتا، ورنہ بدہضمی کا ڈر تھا۔ ظاہر ہے کہ تبصرہ اور بحث مباحثہ کے بغیر دن بھر کے مطالعہ کا اپھار کیسے دور ہو پاتا۔ حد تو یہ کہ وہ اخبارات کے ایسے تبصرے اور مضامین بھی پڑھ ڈالتے تھے، جو اخبار والے محض جگہ پر کرنے کے لیے دے دیا کرتے ہیں، یہاں مراد اردو اخبار والوں سے ہے۔

منشی مرحوم کا خیال تھا کہ اگر خبروں اور تبصروں پر پبلک تبادلۂ خیال نہ کرے تو پھر اخبار پڑھنے کا مزہ ہی کیا، چناں چہ موصوف مطلب کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قومی اور بین الاقوامی مسائل اور احوال وواقعات پر تبصرہ کرتے، لیڈروں پر تنقیدیں کرتے، سیاست کے بال کی کھال نکالتے، ایڈیٹروں پر نکتہ چینی کرتے، ناپسندیدہ پارٹیوں پر کیچڑ اچھالتے اور حکومت کو تختۂ مشق بناتے، بحث اور حجت میں کبھی کبھی ایسی گرما گرمی پیدا ہوجاتی کہ تکرار تک نوبت آجاتی؛ کیوں کہ ان کی ٹکر کے کچھ اور بھی اخبار بیں شہر میں پائے جاتے تھے، جیسی کہ مثل مشہور ہے ''ہر سیر پر سوا سیر ہوتا ہے''۔ یہ اور بات ہے کہ منشی جی کے حریف بھی انہیں کی طرح اختلاج سے لے کر قبض تک کے مریض تھے؛ لیکن ایک معاملے میں منشی جی کا پلڑا سب سے بھاری تھا؛ یعنی ان کی طرح شہر میں مشہور اور مقبول کوئی حریف نہ تھا، پھر بھی بحث وتکرار میں ہاتھا پائی سے کئی بار بال بال بچے۔

منشی مرحوم کچھ ایسے احمق تو تھے نہیں کہ اخبار خرید کر پڑھتے۔ اخبار خرید کر پڑھنے کی بدقسمتی دوسری زبان والوں کے حصے میں آئی ہے۔ منشی مرحوم اردو اخبار بینوں کی شاندار روایت پر حرف آنے دینا نہیں چاہتے تھے اور پھر خرید کر بھی تو کوئی ایک ہی اخبار پڑھ سکتا ہے؛ مگر منشی مرحوم کی بات ایک اخبار سے کہاں بنتی تھی، ان کی بلانوشی کی تسکین کے لیے تو میخانے کا میخانہ چاہیے تھا، سیاست کی انسائیکلوپیڈیا بننے کے لیے تو اخبارات کا سمندر کھنگالنا ہی پڑتا ہے۔

خیر سے منشی مرحوم کو کوئی اور کام دھندا بھی نہیں تھا۔ کچھ جائیداد سسرال سے ملی تھی اور کچھ لگی بندھی موروثی آمدنی تھی۔ دونوں کو ملا کر بھلے برے دال روٹی چل رہی تھی۔ باقی الا الاخیر سلا تھا۔ یہ تو بے چاری منشیائن کی حسرت ہی رہی کہ کبھی قوت بازو سے دو پیسے کما کر بھی لائے ہوتے؛ مگر منشی مرحوم کا تو سارا وقت محلّہ کے ہوٹلوں اور چائے خانوں میں اخبار بینی کرتے گزر جاتا تھا، پھر وہ کمانے کا موقع کہاں سے نکالتے۔ اخبار بینی کرکے اور باخبر رہ کر جو قومی خدمت وہ انجام دے رہے تھے، وہ بھی تو زندگی کی ایک کمائی ہی تھی۔ یہ سعادت بھی کتنے خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہوگی۔ محلّہ کے ہوٹل والے سمجھتے تھے کہ منشی مرحوم چائے پیسے دے کر پیتے ہیں اور کمیشن میں اخبار پڑھتے ہیں؛ مگر منشی مرحوم یہ سوچ کر خوش رہا کرتے تھے کہ اخبار پڑھنے کے پیسے دیتے ہیں اور چائے کمیشن میں پیتے ہیں۔

غرض نوجوانی سے لے کر بڑھاپا شروع ہونے تک منشی مرحوم کا یہی حال اور یہی مشغلہ رہا اور ان کی اہلیہ نے بھی اس میکانکی ڈھنگ کی سپاٹ زندگی سے بہت حد تک سمجھوتہ کرلیا تھا۔ آخر وہ غریب کرتی بھی کیا، جب میاں کی قسمت میں قومی خدمت ہی لکھی تھی تو وہ اس کو کیسے مٹا سکتی تھی۔

آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خوش قسمتی، یا بدقسمتی سے منشی مرحوم کے پڑوس میں بالکل آمنے سامنے اخبار کا ایک پرانا گھاگ ایڈیٹر آبسا، ان کی مراد تو برآئی، انہیں کیا خبر تھی کہ یہی ایڈیٹر ان کے لیے مسیحا ثابت ہوگا اور قومی خدمت کے دیرینہ آزار سے چھٹکارا دلا دے گا؛ کیوں کہ اس نبض شناس ایڈیٹر نے پہلی ہی ملاقات میں جملہ امراض کی جڑ کی تشخیص کرلی تھی، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ بات وہی تھی کہ گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے، وہ ساری بیماریاں جو منشی مرحوم کو تھیں، وہ سب ایڈیٹر موصوف کو بھی تھیں۔ فرق اتنا تھا کہ ایڈیٹر کو ان نامراد بیماریوں کا سبب اور علاج بھی معلوم تھا؛ مگر وہ غریب اپنے علاج سے معذور تھا؛ کیوں کہ اس کا مرض نوشتۂ تقدیر تھا، جب کہ منشی مرحوم کا مرض پالتو تھا؛ اس لیے لاعلاج نہیں تھا۔

ہوتے ہوتے جب دونوں گھروں کے تعلقات دوستانہ ہوگئے تو ایک دن باتوں باتوں میں مرحومہ صاحبہ نے اپنے مرحوم کی بدبختی پر رورو کر ایڈیٹر سے فریاد کی اور یہ پیشکش بھی کی کہ جو کوئی منشی مرحوم کو ٹھیک کردے، اس کو منھ مانگا انعام دوں گی۔ ایڈیٹر نے از راہِ خدمت خلق اس کا بیڑا اٹھاتے ہوئے منشیائن کو سمجھایا'' بات یہ ہے کہ محترمہ جدید میڈیکل ریسرچ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ زیادہ اخبار پڑھنے اور سیاست میں سرگرم رہنے والوں کو بیک وقت ایک سوایک بیماریاں لاحق رہتی ہیں؛ کیوں کہ ان کے دل

ودماغ پر ہروقت ایک سوایک باتوں کا دباؤ رہتا ہے، اس دباؤ کی وجہ سے اعصاب میں تناؤ رہتا ہے اور اس تناؤ کے سبب معدے میں کھنچاؤ رہتا ہے، اس کھنچاؤ سے معدے کا فعل گڑبڑ رہتا ہے اور اس گڑبڑ سے پورا جسمانی نظام گڑبڑا جاتا ہے، پھر صحت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے اور آخر میں ایڈیٹر نے بتایا کہ اس کا علاج نہ دوا سے ہوتا ہے، نہ دعا سے؛ بلکہ ایک ٹوٹکا ہے، جس پر عمل کرنے سے اللہ ضرور شفا دے دیتا ہے۔

اگر شرع اور اخلاق مانع نہ ہوتے تو منشیائن اس بشارت پر ایڈیٹر کا منھ چوم لیتیں؛ اس لیے انہوں نے بطور پیشگی شکریہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ''خدا کی قسم، میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک فراموش نہ کرسکوں گی۔''

ایڈیٹر نے دلاسا دیا، ''آپ پریشان نہ ہوں۔ تدبیر آدمی کرتا ہے، شفا اللہ دیتا ہے۔''

منشیائن نے عاجلانہ اشتیاق ظاہر کیا ''پہلے وہ ٹوٹکا تو بتایئے۔ اگر گھپ اندھیری رات میں مرگھٹ سے پرانی کھوپڑی بھی کھود کر لانی پڑے تو میں دریغ نہ کروں گی''

''نہیں نہیں، ایسا کچھ نہیں کرنا ہے، بالکل پریکٹیکل بات ہے''۔

اس کے بعد ایڈیٹر نے ٹوٹکا بتادیا۔ ایڈیٹر کے بتائے ہوئے ٹوٹکے کے مطابق دوسرے ہی دن منشیائن نے بچوں کو گھر سے باہر نکال کر اور کمرہ بند کرکے منشی مرحوم کو غیر متزلزل لہجے میں الٹی میٹم دیا ''تم یا تو اخبار پڑھنا چھوڑ دو، یا مجھے چھوڑ دو، تم جیسے اخباری قیچی کے ساتھ اب میری زندگی نہیں کٹ سکتی، خدا کی قسم میں طلاق لینے کا فیصلہ کرچکی ہوں''۔

منشی مرحوم ہکا بکا ہوکر بیوی کا منھ تکنے لگے، کچھ کہنا چاہا تو منشیائن نے گرج کر روک دیا، ''میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔ اخبار، یا بیوی دونوں میں سے کوئی ایک چن لو''۔

بڑھاپے میں بیوی کے اس انقلابی اقدام پر منشی مرحوم لرز اٹھے، ناک کٹنے کے تصور سے جھرجھری آگئی، نیازمندی سے سر جھکا کر زیرلب بولے ''چلو توبہ کرتا ہوں، باقی زندگی تم کو پڑھنے میں گزار دوں گا''۔

شام کو لوگوں نے دیکھا کہ منشی مرحوم سر جھکائے مصلی اور تسبیح خرید کر سیدھے گھر کا رخ کیے چلے جارہے ہیں، کسی نے آواز بھی دی تو سنی ان سنی کردی۔ ہوٹل اور چائے خانے کے سامنے سے گزر گئے؛ مگر نظر تک نہ اٹھائی اور تیسرے ہی دن سے منشی مرحوم میں صحت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ایڈیٹر نے میاں بیوی کو راضی خوشی دیکھ کر اپنی کھڑکی سے نعرہ لگایا ''انقلاب زندہ باد۔''

خاکہ

حضرت مولانا (حصہ اوّل)

مجھے ایک خادم قوم کا دوست ہونے کا فخر حاصل ہے، حضرت مولانا۔ یہ ان کا نام نہیں، عرفیت ہے۔ حضرت مولانا میرے ہم نوالہ وہم پیالہ تو نہیں پھر بھی دوستی پکی ہے۔ حضرت مولانا کی قوس قزحی شخصیت پر کچھ لکھنا بڑا مشکل ہے۔ نگاہ کسی ایک رنگ پر ٹھہرتی ہی نہیں، جس رنگ پر نظر پڑتی ہے، وہی دل کو لبھاتا ہے۔ ایسی چکاچوند شخصیت پر ترتیب دار لکھنا میرے لیے ممکن نہیں، جو بات جیسے ذہن میں آئے گی، لکھتا جاؤں گا۔ حضرت مولانا کی چکنی شخصیت کو ذہن کی گرفت میں لینا بڑے فن اور ہنر کی بات ہوگی اور میرا فن اور ہنر اس سے قاصر ہے، پھر بھی کوشش کر دیکھنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ ایک اخلاقی فرض ہے اور دوستانہ قرض بھی۔

قرض کی بات آگئی ہے تو بسم اللہ اسی سے کرتا ہوں، حضرت مولانا سے میں دو بار قرض لے چکا ہوں۔ ایک بار پانچ، دوسری بار دس؛ مگر تیسری بار کامیابی نہ ہوسکی۔ دراصل ٹریجڈی یہ ہوئی کہ قرض لینے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ اگر قرض لے کر حضرت مولانا کو واپس نہ دیا جائے تو مضائقہ نہیں، تعلقات پر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک صاحب کی مثال میرے سامنے موجود تھی، جو نہ جانے کتنی بار اور کس کس حیلے سے حضرت مولانا سے قرض لیا کرتے تھے اور وہ صاحب اتنے پہنچے ہوئے تھے کہ حضرت مولانا سے قرض کے بہانے کھینچی ہوئی رقم کو اپنی آمدنی میں شمار کرتے تھے۔ معلوم نہیں، ان صاحب سے مولانا کی کون سی نازک رشتہ داری ہے کہ ان کو ناواجب الادا قرض ہمیشہ سے دیتے آئے ہیں اور آج بھی دیتے ہیں، چاہے بہ رضا ورغبت، یا طوعاً وکرہاً؛ مگر میرے نصیب نے تو تیسری بار یاوری نہیں کی؛ کیوں کہ مولانا کو میرے بارے میں بھی شک گزر گیا کہ یہ شخص بھی انہیں صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کررہا ہے، انکار تو نہیں کیا، البتہ نہایت حسن وخوبی سے طرح دیتے رہے، مثلاً ایک بار مہینے کی پانچویں تاریخ کو میں نے حضرت کے سامنے دست سوال پھیلایا۔ فرمانے لگے کہ اسکول کی ملازمت بھی کیا لعنت ہے، کبھی وقت پر تنخواہ نہیں ملتی؛ بلکہ کوئی وقت ہی مقرر نہیں۔ دیکھئے آٹھ دس تک تنخواہ ملی تو آپ کے لیے کچھ کروں گا۔ میں بھی ایک

ہی ڈھیٹ دس تاریخ کو حضرت مولانا کو پھر دھرا تو مسکرا کر فرمایا ''شین صاحب آپ بھی کیا بھولے ہیں، ہم کوئی ہزار پانسو پانے والے تو ہیں نہیں۔ دس تاریخ سے تو آئندہ تنخواہ کا انتظار شروع ہو جاتا ہے، تنخواہ تو اسی دن مل گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ آپ کا کام تو چل ہی گیا ہوگا؛ اس لیے آپ کو پوچھا نہیں، پس بات سمجھ میں آ گئی کہ قرض امریکہ سے لینا آسان اور مولانا سے لینا مشکل۔

اس کے بعد میں نے مولانا سے قرض حاصل کرنے کی مہم ترک کر دی اور اس کی تلافی دوسرے طریقوں سے کرنے لگا؛ یعنی چائے پان وغیرہ کی صورت میں کچھ تو اپنی اشک شوئی کے لیے اور کچھ انتقاماً؛ لیکن پچھلے سال مولانا ایک بار پھر گرفت میں آ ہی گئے۔ میرے یہاں ایک اہم تقریب تھی۔ صرفِ کثیر کی وجہ سے میں کافی پریشان تھا۔ حضرت کی شامت جو آئی تو حال احوال پوچھ بیٹھے، جس کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ ایک دکان سے اپنی ذمہ داری پر ایک خاص رقم کا سامان ادھار دلوا دیا، ادھار میں چکا ہی رہا ہوں؛ مگر تھوڑا تھوڑا کر کے تقاضے کی تلخی اور ذلت مولانا کے سر۔ مولانا بس فریاد و فغاں کر کے رہ جاتے ہیں، حضرت اس قسم کی نیکی کے مرتکب پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ دکاندار آزمودہ را آزمودن جہل است کا قائل نہیں ہے۔

حضرت مولانا کی چو پہل شخصیت دلچسپ کم عبرت ناک زیادہ ہے؛ کیوں کہ وہ جس پر جتنے مہربان ہیں، وہ اتنا ہی انہیں تختۂ مشق بنایا کرتا ہے۔ ہائے مظلومی! ایک مجھ ہی کو دیکھئے کہ وہ مجھ پر کتنے مہربان ہیں اور میں کس شوخی سے ان کا ذکر کر رہا ہوں؛ مگر جن لوگوں پر حضرت مولانا زیادہ مہربان ہیں، وہ تو تحقیر اور دل آزاری تک کیا کرتے ہیں، پھر بھی حضرت مولانا ظرف کے اعتبار سے آدمی نہیں، سمندر ہیں۔ ظاہر ہے سمندر میں اس شوخی کی ترشی بھی حل ہو کر ناپید ہو جائے گی۔

یہ تو آپ پر منکشف ہو ہی چکا کہ مولانا کسی اسکول میں ملازم ہیں۔ ملازم نہیں، ٹیچر کہئے۔ اس کے علاوہ حضرت ایک اردو انجمن پر بھی اپنی خدمات کو سالہا سال سے ارزاں کیے ہوئے ہیں۔ آج تک کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ انجمن کی آبرو، ان سے ہے، یا ان کی آبرو انجمن سے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بات تو ضرور ہے؛ مگر مجھ جیسا محتاط آدمی نصفا نصف سمجھتا ہے؛ یعنی ایک کی آبرو دوسرے سے ہے؛ کیوں کہ جہاں تک انجمن اور حضرت مولانا کے جائز، یا ناجائز تعلقات کا معاملہ ہے، وہ ''من تو شدم تو من شدی' کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ انتہا یہ کہ مولانا کو انجمن کے دفتر کا اپنی جیب سے باہر رہنا گوارہ نہیں۔

توبہ، بات سے بات نکلتی جا رہی ہے اور حضرت مولانا کا حلیہ بتانا یاد ہی نہیں رہا، حالانکہ مولانا کی سیرت کی ابتدا ہی صورت سے ہوتی تھی۔ خیر اب بیچ میں آ کر حلیہ کی تفصیل میں کہاں پڑوں۔ اجمالاً

عرض کرتا ہوں کہ مولانا کا حلیہ وہی ہے، جو عام طور پر اینگلو پرشین، یا ندوی مولویوں کا ہوا کرتا ہے۔ مونچھیں خشخشی، یا بقدر اشک بلبل، داڑھی لہسن کی جڑ سے کچھ زیادہ، جس کو عرف عام میں چگی داڑھی کہتے ہیں۔ تنگ موری کا پاجامہ اور موسم کے اعتبار سے ادلتی بدلتی ہوئی لمبی شیروانی۔ ٹوپی رائج الوقت، قد میانہ، رنگت سانوی سلونی، ناک چپٹی نہیں، دہانہ مردانہ، آنکھیں تیر نیم کش نہیں تو کچھ ایسی بری بھی نہیں۔ ہنسی ہم لوگوں کے لیے قابل برداشت؛ مگر کسی نازک حسینہ کے لیے اینٹی کلائمکس، مسکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ دانتوں کی ساخت دونوں ہونٹوں کے اتصال میں مانع ہے۔ آواز جدن بائی مرحومہ، یا اختری بائی فیض آبادی سے ٹکر لینے والی؛ یعنی اس مغنیہ جیسی جس نے پکے گانوں کے اونچے سروں پر جی توڑ کے ریاض کیا ہو؛ مگر آپ مولانا کی آواز سن کر یہ شعر نہیں پڑھ سکتے ؂

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

کیوں کہ مولانا نے اپنی آواز کے ترنم کو شاید زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ کبھی کبھی مولانا کو 'خلاصہ تقریر' کرنے کا جانکاہ فرض بھی ادا کرنا ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ یا تو حضرت پر سکوت کا عالم طاری ہے، یا کسی دہشت سے گھٹ گھٹ کر یوں بول رہے ہوں، جیسے کسی ہکلے کی پیروڈی کر رہے ہوں۔ سر پر انگریزی بال، چال زخمی، چلن نیشنلسٹ، چال اور چلن دونوں ملا کر بے ضرر۔ اب آخری چیز مولانا کی عمر ہے۔ اس معاملے میں حضرت مولانا کی نفسیات عورت؛ بلکہ ایکٹریس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ اپنی عمر جس حساب سے وہ جوڑتے ہیں، اگر ریاضی کے اسی فارمولا سے چودہ پندرہ سال کے لڑکوں کی عمر نکالی جائے تو بقول ایک مرحوم دوست کے وہ لڑکے گویا دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوئے ہوں گے۔ خیر ہو سکتا ہے اس میں حضرت مولانا کی کوئی نجی مصلحت ہو۔ یوں ان کی گول مول عمران کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ وہ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، جب کہ میری عمر ۴۲؍سال ہے۔ اب ۴۲؍میں سے 'بہت' کا ہندسہ کم کر کے ان کی عمر نکال لیجئے کٹے پھٹے کا کوئی نشان ظاہر نہیں، جس کی ضرورت زیادہ تر پولیس والوں ہی کو ہوا کرتی ہے۔

بعد بیان حلیہ معلوم ہو کہ قومی خدمت اور رفاہِ عام کے کاموں میں مولانا دور دور تک شہرت رکھتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ان کی اقامت گاہ میں دور دراز سے آنے والے ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، خاص طور پر امتحانات کے سیزن میں لوگ مولانا سے کامیابی کا اسم اعظم لینے کے لیے پہنچتے ہیں۔ امتحانات ہی پر منحصر نہیں ہے دوسری ضرورتوں سے آنے والوں کی بھی کمی نہیں کبھی کبھی تو

ضرورت مندوں کی اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ مولانا کو اپنی کوٹھری میں قدم رنجہ فرمانے کی گنجائش نہیں ملتی اور وہ راتوں کو کئی بار خود اپنی شب گزاری کے لئے کسی کسی ہمسایہ کے در پر دستک دیتے پائے گئے ہیں۔ حضرت مولانا کے دل اور ان کی کوٹھری دونوں میں کچھ مماثلت ہے، جس طرح مولانا کا دل دیکھنے میں ذرا سا اور وسعت میں بیاباں ہے، اسی طرح ان کی اقامت گاہ دیکھنے میں ایک کوٹھری؛ مگر مصرف میں مسافر خانہ ہے، جس طرح کبھی کبھی کوٹھری میں مولانا کے لیے جگہ نہیں رہتی، اسی طرح کبھی کبھی نہیں؛ بلکہ اکثر اوقات ان کے دل متین میں بھی خود اپنے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ ایک بے لوث خادم قوم کی اس سے بڑی پہچان اور کیا ہو سکتی ہے؛ مگر زمانے میں بد بینوں کی کمی نہیں، بعض مسخروں کا حال یہ ہے کہ ادھر حضرت مولانا نئی شیروانی پہن کر نکلے، ادھر یہ ہوا چل گئی کہ یا تو ماضی قریب میں کوئی کانفرنس ہوئی ہے، یا مستقبل قریب میں ہونے والی ہے۔ گویا بد بینوں کے خیال میں نئی شیروانی اور کانفرنس میں چولی دامن کا رشتہ ہے، حالانکہ مولانا کی سادگی اور معصومیت کا یہ عالم ہے کہ یاران کانفرنس خود مولانا کی لنگوٹی تک کو پبلک کا مال سمجھتے ہیں۔ شاید اسی خدشے سے مولانا لنگوٹ کا استعمال پابندی سے کرتے ہیں کہ مبادا پبلک کے مال کا چسکا رکھنے والے شیروانی پاجامہ کو بھی کانفرنس کے فنڈ میں ضم کر لیں تو کم از کم گھر تک واپس آنے کی صورت تو باقی رہے؛ یعنی کم از کم لنگوٹی تو 'آبرو پوشی' کا کام دے جائے گی۔

حضرت مولانا کی ایک مشہور خصوصیت یہ ہے کہ وہ بلا معاوضہ کام کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے؛ بلکہ کچھ لوگ مولانا کے گرد و پیش ایسے بھی ہیں، جو مولانا سے کام بھی لیتے ہیں اور دام بھی، ہم خرما و ہم ثواب۔ حضرت مولانا کے جذبۂ ایثار و بے لوثی کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ مولانا کھانا پکاتے ہیں، کھانا نکالتے ہیں، دستر خوان بچھاتے ہیں، کھانا چنتے ہیں اور اس کے بعد دستر خوان سمیٹ کر جوٹھے برتن تک دھوتے ہیں؛ مگر خود کھانے سے گریز و پرہیز ہے؛ بلکہ جب کھانے والے کھا رہے ہوتے ہیں تو وہ پانی کا گلاس لیے کھڑے رہتے ہیں؛ تاکہ کھانے والوں کے حلق میں نوالہ اٹکنے نہ پائے۔ بعض لوگوں کا؛ بلکہ میرا بھی خیال یہی ہے کہ مولانا کھانا بھی چاہیں تو نہ کھا سکیں گے؛ کیوں کہ نوالہ کے برتن سے لے کر حلق تک پہنچنے میں جس ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے وہ بے بہرہ ہیں، یا یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ پکانا ایک فن ہے اور کھانا دوسرا، چناں چہ میں ایک خاتون کو جانتا ہوں جو مچھلی بہت اچھی پکاتی ہیں؛ مگر خود نہیں کھاتیں، کہتی ہیں کہ کانٹے سے ڈر لگتا ہے؛ مگر خود حضرت مولانا کے دیدۂ عبرت گواہ ہیں کہ زمانہ میں ایسے مشاق اور ماہرین فن بھی پائے جاتے ہیں،

جو کانٹوں سمیت مچھلی کھا جاتے ہیں۔ قصہ مختصر بعد بدگمان حضرات مولانا کو عبث نام دھرتے ہیں۔

ہاں تو ذکر تھا مولانا کی قومی اور رفاہی خدمات کا اور اس سلسلے میں ان کے بے لوثی اور ایثار پسندی کا تو مولانا کی انتہا پسندانہ قومی دردمندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس راہ میں فنا ہونے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں، بال بچوں کو بھی قوم پر قربان کر دینا چاہتے ہیں، جب حضرت ابراہیم خدا کی راہ میں بیٹے کو ذبح کرنے لگے تو جھٹ جنت سے دنبہ بھیجا گیا اور چھری بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن پر چل گئی؛ مگر جس قوم کی مولانا خدمت کرتے ہیں، اس کا مزاج اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ قوم کی راہ میں اپنا ایک بیٹا ذبح کر رہے ہوں تو قوم مچل جائے گی کہ واہ ایک ہی کیوں؟ آپ کے پاس دوسرا بیٹا بھی تو ہے؛ یعنی دونوں کی؛ بلکہ جو پیدا ہونے والا ہو، اس کی بھی گردن ریت کر اپنی پیاری قوم کی خدمت کیجئے، جو جیتے جی موقع پا کر آپ کے منھ پر تھوک سکتی ہے؛ مگر مرنے کے بعد آپ کی قبر پر تھوکنے بھی نہیں جائے گی۔ کچھ یہی لیل و نہار حضرت مولانا اور ان کی قوم کے درمیان چل رہے ہیں۔ میں بعض ستم ظریفوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ چاہے قوم حضرت مولانا کی گراں قدر خدمات کی طلب گار نہ ہو؛ مگر حضرت مولانا کو ضد ہے کہ وہ دامے، درمے، قدمے، سخنے اور قلمے مرتے دم تک قوم کو اپنی نامطلوب خدمات سے نوازتے رہیں گے۔ اگر قوم ان کی خواستگار نہیں ہے تو یہ خود قوم کی بد نصیبی ہے، حضرت مولانا کا کچھ نہیں بگڑتا؛ بلکہ حضرت مولانا قوم کی ادائے بے نیازی کے باوجود جس اولوالعزمی اور ہٹ دھرمی سے قوم کو ممنون کرنے پر اڑے ہوئے ہیں، اس میں ان کی قومی سربلندی اور انسانی عظمت ہے۔ مثالیں تو ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ اسی قسم کی اولوالعزمی اور قیادتِ بالجبر سے لوگ اپنے آپ کو منسٹر تک بنا کر قوم پر مسلط کر لیا کرتے ہیں، جب کہ ہمارے حضرت مولانا کا ذہن اس قسم کی حسرتوں اور آرزوؤں سے بھی پاک ہے، ان کا شعار قوم کو کچھ دینا ہے، قوم سے کچھ لینا نہیں۔

حضرت مولانا خیر سے شہر کے پرانے اخبار نویسوں میں بھی ہیں۔ ماشاءاللہ متعدد اخباروں کو آپ کے ہاتھوں تجہیز و تکفین کی سعادت نصیب ہو چکی ہے اور سنا جاتا ہے کہ ان دنوں ایک اور کے لیے گورکن اور کافور و کفن کی تلاش میں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں اخبار کی تجہیز و تکفین لکھی ہے، یا اخبار کے ہاتھوں انہیں قومی آزار سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ سخت جانی میں دونوں ایک دوسرے سے کم نہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ بھی دعا کیجئے کہ قوم ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی محروم نہ ہونے پائے؛ بلکہ بین بین کوئی حل نکل آئے۔

حضرت مولانا کے بارے میں یہ شک شاذ ونادر ہی گزر سکتا ہے کہ وہ شاعری جیسے لطیف فن پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہوں گے۔ میرے سامنے ان کا نمونہ کلام وغیرہ تو نہیں؛ مگر سنتے ہیں کہ زندگی کے کسی دور میں ان سے یہ خطا بھی سرزد ہوچکی ہے۔ اخبارات ورسائل کے علاوہ مشاعروں تک ان کی شاعری کا نزلہ رجوع کر چکا تھا؛ مگر معلوم نہیں خواب میں کیا نظر آیا کہ شاعری سے تائب ہوگئے۔ گل وبلبل اور زلف ورخسار کی باتیں تو آج بھی ان کے وجدان کو گدگدایا کرتی ہیں اور جب کسی پری وش کا ذکر چھڑ جائے تو آج بھی حضرت مولانا کی آنکھیں گلابی ہوجاتی ہیں۔ عاشقانہ رمز وکنایات کے اشعار آج بھی حضرت کو بے تحاشا یاد ہیں، جنہیں ایک لہک کے اور بہک بہک کے سنایا کرتے ہیں۔ ویسے مزاج میں شاعرانہ عنصر موجود ہے، اس کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ شاعری نے ان کو چھوڑا یا، انہوں نے شاعری کو۔ یہ بھی طے نہیں کیا جاسکتا کہ اس ترک تعلق میں انہوں نے شاعری پر احسان کیا، یا شاعری نے ان پر؛ مگر اتنا ضرور ہے کہ جو ہوا سو اچھا ہی ہوا، ورنہ کلیم الدین احمد وغیرہ جیسے نقاد غزل گوئی کو محض 'نیم وحشی' صنفِ سخن کہنے پر اکتفانہ کرتے۔

اب میں حضرت مولانا کی زندگی کے بہتیرے عبرتناک واقعات میں سے صرف ایک مشہور ومعروف واقعہ پر ذکر حبیب کا اختتام کرتا ہوں۔ یہ ایک ہی واقعہ ایسا ہے، جس کے اسرار ورموز کی تفسیر وتشریح لکھنے کے لیے ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ ذہین سوانح نگار اس ایک واقعہ کی روشنی میں حضرت مولانا کے 'آں دم' سے ایں دم تک کے حالاتِ زندگی مرتب کرسکتا ہے، مجھ حقیر فقیر کی کیا حقیقت کہ سمندر کو کوزے میں بند کرسکوں، راوی کی گردن پر دروغ رکھتے ہوئے محض واقعہ بیان کردینے کی جسارت کررہا ہوں۔

بات یہ ہے کہ اس خون چوسنے والی جونک؛ یعنی نامراد قوم کی نحوست کا سایہ حضرت مولانا کی عائلی زندگی پر بھی پڑا ہے، جیسا کہ قومی خدمت کرنے والوں کی روایت زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے (یہاں ذرا احتیاط لازم ہے، کہیں ''قومی ملازمت' کرنے والوں کو بھی آپ سہواً قومی خدمت کرنے والوں کے زمرے میں نہ لے لیں۔) کیوں کہ قومی خدمت اور قومی ملازمت میں وہی فرق ہے، جو شہد کی مکھی اور شہد کے کھانے والوں میں ہے۔ خیر کسی کی عائلی زندگی کی بھول بھلیاں میں کسی کو تاک جھانک کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چاہے وہ کسی قومی خادم کی ہو، یا قومی ملازم کی۔ عقل منداں را اشارہ کافی است کے اصول پر ذیل کی روایت میں معمہ اور حل دونوں تلاش کرلیجئے۔

ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ مولانا کے اسکول کی طویل تعطیلات کے دن آگئے، لمبی تعطیلات کے

دن مولانا کے لیے بڑے منحوس ہوتے تھے (شاید اب بھی ہوں) کیوں کہ انہیں قومی خدمات کو ادھورا چھوڑ کر پٹنہ سے منہ موڑ کر مظفر پور کے ایک دور دراز گاؤں میں اپنے بال بچوں کے پاس چلے جانا پڑتا تھا۔ وہ شب وروز جو قوم سے الگ رہ کر بیوی بچوں کی معیت میں بسر ہوتے مولانا کو گویا شاق ہی گزرتے تھے۔ دو چار دن کی چھٹیوں کو تو مولانا پٹنہ ہی میں گول کرجاتے تھے؛ مگر لمبی تعطیلات میں مولانا ایک طرف ہے شمع روشن ایک طرف ہے، ماہ رو والی کشمکش کا شکار ہوجاتے تھے، پھر بھی جہاں قومی خدمت کا سوال ہو، وہاں مولانا کا ذہن بڑی تیزی سے کام کرجاتا ہے۔ بال بچوں کو جھانسہ دے کر ایک ماہ کی چھٹی کو ایک ہفتہ بنالیا کرتے اور انتہائی اضطراب واضطرار کے عالم میں پٹنہ کے قومی پلیٹ فارم پر واپس آجاتے، جب تک گھر رہتے انہیں یہی احساس ستایا کرتا کہ نہ جانے ان کے غائبانہ میں ان کی معصوم قوم پر کیا گزری ہوگی۔

ہاں صاحب تو ایک بار جب مولانا کا اسکول ایک ماہ کے لیے بند ہوا تو ان کا نروس سسٹم بریک کرگیا۔ بال بچوں کے پاس جائیں، یا قوم کے ساتھ رہیں، پھر اللہ اللہ کرکے مولانا کو چند دنوں کے لیے گھر کا قصد کرنے کی توفیق ہوئی۔ وہ بھی شاید دوستوں اور ہمسایوں کے صبح وشام کے اس سوال سے گھبرا کر کہ مولانا اسکول کب کا بند ہوچکا اور ابھی تک آپ گھر تشریف نہیں لے گئے؟ غرض ایک صبح مولانا نے درودیوار کو حسرت سے دیکھا، ملک بھر کی قومی خدمات کے اعمالنامہ؛ یعنی اخبارات کے انبار پر الوداعی نظر ڈالی، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کی ۱۰x۱۰ فٹ کوٹھری کا کم از کم ۳/۴ حصہ اخبارات کے انبار سے اس طرح اٹا پڑا ہے کہ کسی نئے آدمی کو گمان گزرے گا کہ مولانا ردی کا کاروبار بھی کرتے ہیں، اپنے ہمسایہ کو آگاہ کیا کہ چند دنوں کے لیے قوم سے ان کا ساتھ چھوٹ رہا تھا، جھجھک جھجھک کے سامان سفر درست کیا۔ مولانا کی روانگی کا سماں کچھ ایسا تھا، جیسے کوئی شخص طویل مدت کے لیے گھر چھوڑ کر پردیس سدھار رہا ہو۔ کوٹھری کو مقفل کرکے اٹیچی ہاتھ میں لیے مولانا باہر نکلے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس عین وقت پر بھی مولانا کو اونگھتے کو ٹھیلتے والے بہانے کی تلاش تھی؛ مگر چار و ناچار سینے پر قوم کا داغ فراق کھانا ہی پڑا اور مولانا سوئے وطن روانہ ہوگئے، پٹنہ میں قوم کو تنہا چھوڑ کر۔

دوسری صبح ہمسایوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مولانا اپنی کوٹھری میں بدستور دھرے ہیں، معلوم ہوا کہ آدھی مسافت طے کرکے مظفر پور پہنچنے پر انہیں ایک نہایت اہم اور ارجنٹ کام یاد آگیا۔ سوچا گھر تو جانا ہی ہے، اس ایک کام کو بھی نپٹاتے ہی چلیں۔ سو بارہ بجے رات کی ٹرین سے واپس

آ گئے، اس کے بعد چھٹیاں ختم ہوگئیں؛ مگر مولانا کا وہ قومی کام ختم نہ ہوا، جس کو عجلت میں ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف چل پڑے تھے۔

جب اسکول کھل گیا اور بال بچے مولانا کی راہ دیکھتے دیکھتے مایوس ہوگئے تو راوی کہتا ہے کہ گھر سے مولانا کے حضور میں ایک شکایت نامہ پہنچا۔ الفاظ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ آہ وزاری کے بعد جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کا مختصر مفہوم کچھ یوں تھا کہ آخر ہم آپ کی یادوں کے سہارے کب تک جئیں۔ بے نیازی اور بے گانگی نے گھائل کردیا ہے۔ حقیر سراپا تقصیر کی خطائیں معاف کرکے شادو آباد کریں۔

راوی کا بیان ہے کہ مولانا بال بچوں کو معذرت کا خط لکھا اور بتایا کہ قومی کاموں کی وجہ سے وہ گھر آتے آتے رہ گئے۔ آئندہ تعطیلات میں ضرور آئیں گے، پھر روای کہتا ہے کہ ایک اور خط مولانا کے گھر سے آیا، جس میں استدعا کی گئی تھی کہ جس قوم کی آپ خدمت کرتے ہیں، اگر ہم اس سے باہر ہیں تو خدارا ہمیں بھی اسی قوم میں شامل کر لیجئے۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی راوی یوں جوڑتا ہے کہ وہ خط مولانا کے دل کو تیر کی طرح لگا اور انہوں نے بگڑ کے جواب دیا کہ یہ پرلے درجے کی ناشکری ہے، آخر بذریعہ خط وکتابت اور بذریعہ منی آرڈر جو خدمت کی جاتی ہے، وہ بھی تو خدمت ہی ہے۔ اب کیا قوم کو چھوڑ کر سارے کا سارا تم ہی لوگوں کے لیے وقف ہوجاؤں۔ میں سب کے حقوق کے ساتھ انصاف کرتا ہوں۔

اس قسم کی قومی خدمات کا اعتراف عموماً مرنے کے بعد کیا جاتا ہے؛ مگر حضرت مولانا کو اس سلسلے میں کوئی عجلت نہیں ہے۔ ایک بار جب میں نے مولانا کو پیشکش کی کہ میں آپ پر جو تعزیتی مضمون لکھوں گا، اس پر اپنا سارا زورِ قلم صرف کروں گا اور اگر وہ بھی کافی نہ ہوا تو کسی اور کا زورِ قلم بھی مستعار لے کر مضمون کو ایسا اثر انگیز اور رقت خیز بناؤں گا کہ پڑھنے والے رورو پڑیں۔ اس وقت آپ کی روح آپ کی خدمت کا اعتراف ہوتے دیکھ کر جھوم جھوم اٹھے گی؛ مگر اس کو کیا کیجئے کہ مولانا خود ہی اس بات کی تمنا لیے بیٹھے ہیں کہ وہ بڑی دھوم دھام سے شین مظفر پوری کا تعزیتی جلوس نکال کر بڑے پیمانے پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کریں گے اور ان کی قومی خدمات کا یہ آخری کارنامہ ہوگا۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے نصیب میں لکھی ہے، میرے، یا ان کے۔

بہرحال میں ابھی سے بصد حسرت و دل سوزی مولانا کے لیے نوحہ کناں ہوں ۔

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی　　تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

اداریہ

حرف اوّل

اردو کے تخلیقی ادب پر بُرا وقت آیا ہے، صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے تخلیقی ادب کا معیار روبہ زوال ہے۔ مقدار میں اضافہ تو افراط وتفریط کی حد تک ہو رہا ہے؛ مگر قدر وقعت کا معاملہ مایوس کن ہے۔ گزشتہ دہائی میں اس انحطاط کی رفتار کچھ تیز ہوئی ہے۔ بات 'ادب عالیہ' کی نہیں کہ اس کی حیثیت تو 'تبرک' کی ہے اور تبرک کی مقدار مٹھی بھر نہیں؛ بلکہ چٹکی بھر ہوتی ہے۔ یہاں مراد محض اچھے تخلیقی ادب سے ہے، جو زبان وبیان کے معیار اور فکر وفن کی ٹیکنک پر پورا اترتا ہو۔ 'اچھا ادب' کا کم از کم معیار اچھی زبان کو کہا جاسکتا ہے۔ ادب کے قاری کی تعداد تو تشویشناک حد تک کم ہوتی ہی جارہی ہے؛ مگر وہ ادب بھی بحران سے دوچار ہے جس کو فنی محاسن کی بنیاد پر نہ سہی، کم از کم زبان وبیان کی صحت وعمدگی ہی کی بنیاد پر اچھا کہہ سکیں۔ زبان کی خوبی اور مہارت صحبت، ماحول اور کاروبار حیات میں اس کے استعمال سے ہے۔ نہ وہ اردو کا ماحول رہا نہ وہ تعلیمی معیار رہا۔ خود اردو تہذیب دم توڑ رہی ہے۔ اردو گھرانوں تک میں اردو کی تہذیبی خوشبو معدوم ہوتی جارہی ہے، پھر بھی اردو زبان تو زندہ ہے۔ اردوداں اور اردوخواں بھی موجود ہیں، اردو ادیب وشاعر بھی باقی ہیں۔ محفل میں وہ جوش وخروش نہ رہا، جام و مینا میں وہ مئے نہ رہی؛ مگر مئے خانہ تو موجود ہے۔ خستہ حال سہی؛ مگر ساقی کو تو زلف ورخسار اور نوک پلک سے اپنی دل آویزی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ کون جانے محفل پھر کب رنگ پہ آجائے۔ غالبؔ کے بقول ساقی کا 'جلوہ دشمن ایمان وآگہی' تو گرمیِ محفل کے لیے باقی رہے۔

خیر یہ تو قلم اپنی رو میں ذرا شاعری کر گیا۔ یہ ایک مسلمہ معیار ہے کہ اہل قلم (بہ شمول صحافی) کو بنیادی طور پر کسی نہ کسی درجے کا ادیب بھی ہونا چاہیے اور ادیب کے لئے زبان داں ہونا لازمی ہے، جب زبان ہی نہ آئے اور ذخیرۂ الفاظ ہی نہ ہو تو ادبی تحریر کا کیا سوال؟ یقیناً زبان سے مراد محض املا اور قواعد (گرامر) کی درستگی نہیں؛ بلکہ اس کو محاورات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات، جامع الفاظ اور وسیع المعانی جملوں سے بھی آراستہ ہونا چاہیے، تب وہ 'ادبی' زبان کہلائے گی۔ الفاظ کا محلِ استعمال اور اظہار مافی الضمیر کے لیے صحیح مفہوم واضح کرنے والے الفاظ کا انتخاب؛ مگر آج ادیب کے ان کم سے

کم اوصاف پر کتنی ادبی تحریریں پوری اترتی ہیں! ابتدائی درس وتدریس والی تحریروں میں تو قواعد کے اعتبار سے صحیح اور سادہ زبان چل جاتی ہے؛ مگر تخلیقی اور تنقیدی ادب میں محض اتنے سے بات نہیں بنتی (گرچہ یہ ''محض اتنے'' والا سلیقہ بھی کتنوں کو ہے) یہاں برسبیل تذکرہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اردو ادیب کے لیے، یا بہ الفاظ دیگر ادبی زبان لکھنے کے لیے فارسی دانی ضروری ہے، زیادہ نہیں تو کم کم ہی سہی۔

یہ تو ہوئی تخلیقی ادب کے بنیادی معیار کی بات؛ لیکن وا حسرتا کہ اردو کے زوال پذیر دور میں شائع ہونے والی بعض تخلیقی تحریریں اس پر بھی پوری نہیں اترتیں، بعضوں میں ''فکر وفن'' کا عالم تو اور بھی مظہر عبرت ہوتا ہے۔ مانا کہ رطب ویابس سے کوئی دور خالی نہ رہا؛ مگر ایسا اندھیر بھی نہ ہوا ہوگا! بعض ایسی چیزیں بھی نظر سے گزرتی ہیں، جو دوسرے معنوں میں تو عمدہ اور معیاری ہوتی ہیں؛ مگر 'ادبیت' کے معاملے میں ادب شناسوں کو مایوس کرتی ہیں۔ ایسی ادنیٰ، یا خام تحریریں اردو زبان کے ادبی مستقبل کے لیے نیک شگون نہیں کہی جاسکتیں۔

معمولی تعلیم یافتہ لوگوں کی تو بات ہی کیا۔ اگر ان کے ہاں اظہار خیال کے لیے الفاظ کی کمی ہو، تلفظ ناقص ہو، یا تذکیر تانیث اور واحد جمع کی تمیز نہ ہو تو چنداں قابل شکایت نہیں؛ مگر ستم یہ ہے کہ اکثر اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی اپنی مادری زبان صحت کے ساتھ لکھنے اور بولنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اچھی زبان لکھنے اور صحیح زبان بولنے والوں کی تعداد تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔ اس کے اسباب بہتیرے ہوسکتے ہیں، جن کے تجزیہ کا یہ محل نہیں۔ محض اظہار حقیقت مقصود ہے۔ اسی خوبی سے پڑھے لکھے طبقہ سے اردو زبان کو ادیب وشاعر، فن کار وصحافی، خطیب اور استاد ملتے ہیں اور اسی طبقے سے اردو ادب کو قاری بھی ملتے ہیں؛ مگر اس طبقہ کی ننانوے فیصد اکثریت ذوق مطالعہ ہی سے معریٰ ہے۔ باقی ایک فیصد میں بھی ننانوے فیصد وہ ہیں، جو زبان آشنا تو ہیں؛ مگر ادب آشنا اور فن شناس نہیں اور اس طرح کٹ چھٹ کر جو مٹھی بھر لوگ بچے وہی ادیبوں، فن کاروں اور ادب کے قاریوں پر مشتمل ہیں۔ یہ تعداد بھی روبہ انحطاط! اسی تعداد میں وہ اہل قلم اور فنکار بھی شامل ہیں، جن کی طرف سطور ماقبل میں (بادل ناخواستہ) بہ اندازِ دیگر اشارہ کیا گیا ہے۔ کوئی بتائے کہ اردو زبان وادب کا معیار ووقار کیوں کر بلند ہو!

قیاس کن زگلستان من بہار مرا!!

شیںؔ مظفر پوری

(رسالہ ''زبان ادب''، پٹنہ، مئی جون ۱۹۹۰ء)

مکتوب

احمد ندیم قاسمی کے نام

(منٹو اور عسکری بھی پڑھ لیں تو مضائقہ نہیں)

محترم ساتھی!

''سنگ میل'' میں سعادت حسن منٹو کے نام آپ کا طویل مکتوب پڑھا، پڑھ کر آپ کی سادگی اور خوفزدگی پر ترس آیا۔ آپ نے اپنے خط میں جن تاثرات اور بے بنیاد اندیشوں کا اظہار کیا ہے۔ وہ میں نے آپ کے اور ہاجرہ بہن کے خطوط میں بھی بھانپ لیے تھے، جو مجھے ذاتی طور پر لکھے گئے۔ میں حیران ہوں کہ آپ جیسا سنجیدہ اور بالغ نظر ادیب بھی باطل کے رعب میں آکر احساس کمتری میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ آپ کے زیر حوالہ خط میں خود اعتمادی کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ آپ کا سہما سہما سا انداز بیان شکست خوردگی اور کم حوصلگی کی غمازی کرتا ہے، جو یقیناً آپ کے اور ترقی پسند ادب کے مستقبل کے لیے فال نیک نہیں، آپ کے خط میں جا بجا جذباتی اور نظریاتی الجھاؤ کی جھلک بھی ملتی ہے۔ آپ کی نیک نیتی قابل قدر ہے؛ لیکن آپ کی کم ہمّتی قابل داد نہیں، میں آپ کی ذہنی کشمکش کے بارے میں اسی دن سے سوچ رہا تھا، جب آپ نے مجھے لکھا تھا (الفاظ یاد نہیں مفہوم یہ تھا) کہ اگر مخالفتوں کا ردعمل نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں، جب ہمیں؛ یعنی ترقی پسند ادیبوں کو پڑھنے والا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ آپ نے منٹو کے نام جو خط شائع کیا ہے، اس کا پس منظر بھی یہی اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے اس کمزور اور غیر محتاط طرز اظہار سے نہ صرف مجھے؛ بلکہ آپ کے تمام ادبی رفیقوں کو دکھ پہنچا ہے اور وہ آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آئندہ فاشسٹوں کی بندر بھبکی میں آکر بوکھلانے سے پرہیز کریں۔ میرے عزیز ساتھی! ممکن ہے آپ کی اس روش میں کوئی مخلصانہ مصلحت ہو؛ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ نو وارد ادیبوں کے ذہن وفکر میں تذبذب پیدا ہوتا ہے، جو لوگ ہمارے لیے مرچکے ہیں، ان کا ماتم نہ کیجیے؛ بلکہ جو لوگ بھرپور

ولولوں اور جوان امنگوں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہے ہیں، انہیں خوش آمدید کہہ کر اپنے آدرش کو پروان چڑھائیے۔

آئیے کچھ دیر کے لیے ہم مل بیٹھیں اور اس سلسلے میں تھوڑی سی بات چیت ہو جائے۔

آپ اردو ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور آپ کا شمار نمائندوں میں ہوتا ہے۔ آج کا ادب چونکہ نظریاتی ادب ہے؛ اس لیے آپ کو سختی کے ساتھ اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ آپ کے قلم سے کوئی لفظ ایسا نہ نکلے، جو ہمارے نظریات میں لچک پیدا کرتا ہو؛ لیکن آپ نے جو خط منٹو کے نام لکھا ہے، اس میں آپ کی کمزوری اور بے اطمینانی کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں اس خط کے کسی حصہ کو مثال کے طور پر پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ اس خط کے ذریعہ مجھے جو کچھ کہنا ہے، وہ یہ نہیں ہے، البتہ اگر آپ چاہیں گے تو میں علاحدہ خط میں اس پر روشنی ڈالوں گا؛ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ان سطور کے ملاحظہ کے بعد جب آپ دوبارہ اپنے خط کو پڑھیں گے تو استفسار کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

سعادت حسن منٹو کو میں اس وقت سے جانتا ہوں، جب سے میں نے ادبی دنیا میں آنکھیں کھولی ہیں، ان کے پندرہ بیس افسانے پڑھے ہیں، جن میں (بو، کالی شلوار اور جانکی بھی شامل ہیں) ان کے مضامین کا مجموعہ بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ میں نے منٹو سے بہت کچھ سیکھا ہے، ان کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں، مثلاً غیر مبہم انداز بیان، اسلوب کی چستی اور پختگی، فنی ندرت اور سچ بات تو یہ ہے کہ موجودہ اردو ادب کو اسلوب کی جدتوں سے مالا مال کرنے میں منٹو کا بڑا حصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے ادب کے معماروں میں انہیں درجہ امتیاز دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے ہمارے دل میں محبت بھی ہے اور احترام بھی۔ گو انہوں نے اپنے دائرۂ فکر کو بہت محدود رکھا اور ادب کی ترقی پسند تحریک کو ان کی نگارشات سے فائدہ برائے نام پہنچا ہوگا؛ لیکن بدنامی زیادہ ہوئی؛ کیوں کہ ان کا فکری محور جنس تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں جنس بھی ایک توجہ طلب موضوع ہے؛ لیکن اس قدر نہیں جس قدر منٹو نے اپنے آپ کو پریشان کیا ہے۔ جنس کے ساتھ زندگی کے دیگر ان گنت مسائل بھی تھے، جو نسبتاً منٹو کی فنکاری اور تنقید کے زیادہ مستحق تھے؛ لیکن منٹو کے فن میں داخلیت بہت زیادہ تھی؛ اس لیے داخلیت اعتدال کی حد سے گزر کر خود غرضی میں تبدیل ہوگئی۔ اور منٹو نے وہی لکھا، جو ان کا جی چاہا۔ وہ بہت کم لکھا، جو انہیں لکھنا چاہیے تھا، جب 'جنس' موضوع اور 'خود غرضی' ذہنیت ہو تو لذتیت کا پیدا ہونا لازمی ہے اور منٹو کے بیشتر افسانے اسی لازم کے ملزوم رہے؛ بلکہ ان کے تمام مشہور افسانوں

پر بھی الزام ہے۔ مخالفین نے ان کے افسانوں کو مثال بنا بنا کر ترقی پسند تحریک کو بدنام کیا۔ یہاں تک کہ حیدر آباد کی کانفرنس میں سجاد ظہیر نے چند دوسرے غیر محتاط ادیبوں کے ساتھ منٹو کے بارے میں بھی یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھی نہیں ہیں؛ کیوں کہ ان کی تحریریں ترقی پسند ادب کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں؛ لیکن اس اعلان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ منٹو کی روش بدلی اور نہ مقبولیت کم ہوئی، ایک تو اس لیے کہ وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کا عبوری دور تھا، دوسرے ان کے فن میں چاشنی اور گھلاوٹ اس قدر تھی کہ لوگ نظریاتی اختلافات کے باوجود پسند کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے افسانے جنسی محرکات سے بھرے ہوئے تھے۔ جنسی بے اعتدالی اور ناآسودگی کے شکار ان کے افسانوں کو اپنی خوراک سمجھ کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ چند ادبی اداروں نے اپنے تاجرانہ مفاد کی خاطر ان کا خوب پروپیگنڈہ کیا اور ان کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مقبولیت کے اس غلط معیار نے منٹو کو اس قدر مطمئن کر دیا کہ ان کی تمام صلاحیتیں ایک ہی مرکز پر تھم کر رہ گئیں۔

اب ترقی پسند تحریک کا بحران اور انتشار تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ نظریاتی احتساب بہت سخت ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ کوئی چاہے بڑے سے بڑا فنکار کیوں نہ ہو؛ لیکن اگر اس کا فن ہمارے نظریات کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا تو ہمارے نزدیک نہ قابل قدر ہے نہ قابل اعتبار۔ ہم ادب اور عوامی زندگی کو ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انسانیت کے مسخ شدہ خدوخال کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انسانیت کے زخموں کو مندمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مذہب، مسلک، شعار، معیار یہی ہے، جو ادیب اس مقدس مہم میں ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارے ساتھی نہیں ہو سکتے؛ بلکہ ان کی طرف نگاہ اٹھانا بھی ہم اپنی توہین سمجھیں گے چاہے، وہ منٹو ہی کیوں نہ ہو۔

ترقی پسند فن کاروں کی فہرست میں اکثریت ان لوگوں کی ہے، جن سے اب تک ترقی پسند تحریک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا، البتہ ان لوگوں نے اس تحریک کے نام پر خوب فائدہ اٹھایا ہے، جب آزمائش کا دور آیا ہے تو ایسے خود غرضوں کی قلعی کھلتی جا رہی ہے، جس میں خلوص نہ ہو ایثار و قربانی کا جذبہ نہ ہو، وہ یقیناً تحریک اور مسلک کا منافق ہے۔ منٹو نے بھی اپنے فن کے ذریعہ اس تحریک کو وہ فائدہ نہیں پہنچایا، جو وہ پہنچا سکتے تھے؛ بلکہ وہ فائدہ اٹھانے کے حق میں زیادہ رہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ منٹو نے منافقت کی ہے؛ لیکن مجھے یہ کہنے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا کہ انہیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ان کی جو لائن ہے، اس کی مقبولیت بڑی تیزی کے ساتھ کم ہو رہی ہے۔ منٹو کے

پڑھنے والے اب جنسیات سے ہٹ کر کچھ اور مانگنے لگے ہیں جو منٹو کے پاس نہیں ہے اب وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑھانے کے بجائے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ سامنے رہیں گے تو تقاضے بھی ہوں گے؛ اس لیے اب وہ اس حلقے سے جا ملے ہیں، جہاں انسانیت اور ذمہ داری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ندیم بھائی! منٹو کے متعلق میں نے جو اظہار خیال کیا ہے، اس کا مقصد آپ کو یہ بتانا ہے کہ منٹو ہمارے لیے مر چکے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں منٹو نے خود اپنے قلم سے اپنے لیے خط تمت کھینچ دیا ہے، ان کا عروج ختم ہوا، یہاں سے زوال شروع ہوتا ہے۔ منٹو نے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے؛ بلکہ خود اپنے نام کو دھبہ لگایا ہے۔ ان کے بچھڑ جانے سے قافلہ نہیں رک سکتا۔ وہ خود گرد کارواں بن جائیں گے، ان کی منزل ماضی کی تاریکی ہے، جہاں وہ پلٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہماری منزل مستقبل کی روشنی ہے، جہاں ہم پہنچنے کی جد و جہد کر رہے ہیں۔ آپ غم نہ کیجیے ہم میں درجنوں منٹو موجود ہیں اور سینکڑوں پیدا ہو جائیں گے، ہمیں صرف اتنا افسوس ہے کہ ہمارا ایک ہونہار ساتھی پیچھے رہ گیا؛ لیکن ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ہم اس کا ماتم بھی کریں۔ ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ہمارے سامنے ایک پروگرام ہے، جس کی قیمت منٹو سے کئی کروڑ گنی زیادہ ہے۔ حسن عسکری کے متعلق آپ نے جو کچھ مجھے کہا ہے اور جو کچھ منٹو کے خط میں لکھا ہے، اس کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان سے نہ صرف مرعوب؛ بلکہ خائف بھی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے عسکری صاحب آپ کو اکیلے پا کر خنجر، یا پستول دکھایا کرتے ہوں۔ آپ لوگ ان کی علمیت اور ذہانت کا بار بار ذکر کر کے نہ صرف یہ کہ خود مرعوب ہوتے ہیں؛ بلکہ دوسروں کو بھی مرعوب کرتے ہیں، آپ لوگ کہتے ہیں کہ حسن عسکری فرانسیسی زبان کے اسکالر ہیں ـــــ ہوں گے! وہ دنیا کی ساری زبانوں کے ہی اسکالر کیوں نہ ہوں، میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ فرانسی ادب کی گندگیوں سے اردو ادب کے دامن کو داغدار بنا رہے ہیں، جیسا کہ اکثر میرے ساتھی کہا کرتے ہیں اور جس کی تائید خود آپ نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔ اس ذہانت کی قدر و قیمت معلوم جو ادب کے نیک مقاصد پر پھبتیاں کسنے کے لیے استعمال ہوتی ہو۔ عسکری صاحب کو میں نے بہت کم پڑھا ہے، البتہ ان کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ ساقی میں ایک آدھ بار جھلکیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں ان کے ذہنی پس منظر کی جو جھلکیاں دیکھیں وہ مایوس کن تھیں۔ پھر پاکستان آ کر میں نے امروز، نورنگ اور نظام میں ان کی چند چیزیں پڑھیں جو نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ طور پر سپرد

قلم کی گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ عسکری صاحب نے کبھی یہ فرمایا تھا کہ بنگال کے قحط پر کچھ لکھنے لکھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ ننگی تصویریں دیکھی جائیں۔ ان کے افسانہ پھسلن کے متعلق بھی میں نے کچھ سن رکھا ہے۔ ان کے بارے میں 'چینی کی پیشاب دانی' سے متعلق بھی کوئی بات مشہور ہے۔ ابھی حال ہی میں عسکری صاحب کی ذہانت نے جو تازہ تخلیق کی ہے، وہ یوں ہے ''شریف انسان کے خلوص اور ادیب کے خلوص میں بڑا فرق ہے۔ شریف انسان چاہتا ہے کہ میں جو بات بھی کروں اس کے اچھے نتائج پیدا ہوں؛ مگر ادیب جب بحیثیت ادیب کے کام کرتا ہے تو اسے یہ خیال ہی نہیں ہوتا یعنی نہیں ہونا چاہیے کہ میری تحریر کے کیا نتائج ہوں گے۔ ادیب کا کام تو یہ ہے کہ اپنے احساسات سے ایمانداری برتے۔ اس نے حقیقت کو جس طرح محسوس کیا ہے بالکل اسی طرح پیش کر دے۔ اس سے بحث نہ رکھے کہ میری تحریروں سے انسانیت کا مستقبل سنوارنے میں مدد ملتی ہے، یا نہیں''۔

میرے بھائی! جو 'ذہین ادیب' اتنی گھنگھور تاریکی میں بھٹک رہا ہو، اسے آپ کہاں تک روشنی دکھائیں گے۔ آپ اور ہمارے دوسرے ساتھی کیوں خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ایک ابو جہل کے ایمان نہ لانے سے اسلام کی تحریک رک نہیں گئی تھی۔ ابو جہل مر گیا؛ لیکن اسلام آج بھی زندہ ہے۔ آپ کو منٹو سے محبت ہے۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے محبت ہے؛ لیکن ہماری انفرادی محبتوں سے وہ محبت کہیں زیادہ مقدس اور قابل احترام ہے، جو ہمیں انسانیت سے ہے اور جو انسانیت کا باغی ہوگا، اس سے ہماری صلح ہو ہی نہیں سکتی۔ چاہے اس کے لیے ہمیں ذاتی محبت ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ اگر منٹو کے بچھڑ جانے سے آپ کی جذباتیت آپ پر غالب آ گئی ہے تو آپ ان کے گھر جا کر یا انہیں اپنے گھر بلا کر افہام و تفہیم کر لیجیے، یا جو خط آپ ان کے نام لکھیں، وہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا کیجیے، کسی رسالے میں اس خط کو شائع کرا کر دوسروں کو اور خود منٹو کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ کیجیے کہ ان کے نکل جانے سے کوئی خلا واقع ہو گیا ہے، اس طرز عمل میں خوشامد اور کمزوری کا پہلو ہے، جس سے ترقی پسند تحریک کی سچائی اور آفاقیت پر حرف آتا ہے۔

کیا میں امید کروں کہ آئندہ آپ منٹو اور عسکری کو ہوّا نہیں سمجھیں گے اور کبھی شکست خوردگی اور کمتری کے احساس کو پاس نہیں پھٹکنے دیں گے؟

(''مضراب''، کراچی۔ اگست ۱۹۴۸ء، مدیر: شین مظفر پوری)

ختم شد

کتابیات

آدھی مسکراہٹ	شین مظفر پوری
آوارہ گرد کے خطوط	شین مظفر پوری
اردو ڈراما کی تاریخ وتنقید	عشرت رحمانی
اردو کا بہترین انشائی ادب	وحید قریشی
اردو کا نسائی ادب	انور سدید
بہار میں اردو افسانہ نگاری	وہاب اشرفی
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور
تین لڑکیاں ایک کہانی	شین مظفر پوری
جادۂ اعتدال	عبدالمغنی
جھلکیاں (حصہ اوّل)	محمد حسن عسکری
چاند کا داغ	شین مظفر پوری
حکایت نامہ	شین مظفر پوری
حلالہ	شین مظفر پوری
خون کی مہندی	شین مظفر پوری
دہکتی رگیں	شین مظفر پوری
دوسری بدنامی	شین مظفر پوری
رقصِ بسمل	شین مظفر پوری
شین مظفر پوری: شخص وعکس	سید احمد قادری
طلاق طلاق طلاق	شین مظفر پوری

قانون کی بستی	شین مظفر پوری
کڑوے گھونٹ	شین مظفر پوری
کسی سے کہنا نہیں	شین مظفر پوری
کھوٹا سکّہ	شین مظفر پوری
لڑکی جوان ہوگئی	شین مظفر پوری
نئی الف لیلہ	شین مظفر پوری
ہزار راتیں	شین مظفر پوری

رسائل

جریدہ-۱	شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، ۲۰۰۱ء
زبان وادب، پٹنہ	جنوری ۱۹۷۶ء، مئی رجون ۱۹۹۰ء
شب خون، الہ آباد	اگست ۱۹۷۱ء
مضراب، کراچی	اگست، ستمبر، دسمبر ۱۹۴۸ء

اخبارات

سنگم (ہفتہ وار)، پٹنہ	جولائی ۱۹۵۹ء
ہمارا بہار، پٹنہ	۲۵رجون، ۲۵راگست ۱۹۵۹ء